﴿هَٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ﴾

یہ قرآن لوگوں کے لیے بصیرت اور ہدایت ہے اور یقین کرنے والوں کے لیے رحمت ہے۔

سورہ جاثیہ آیت20

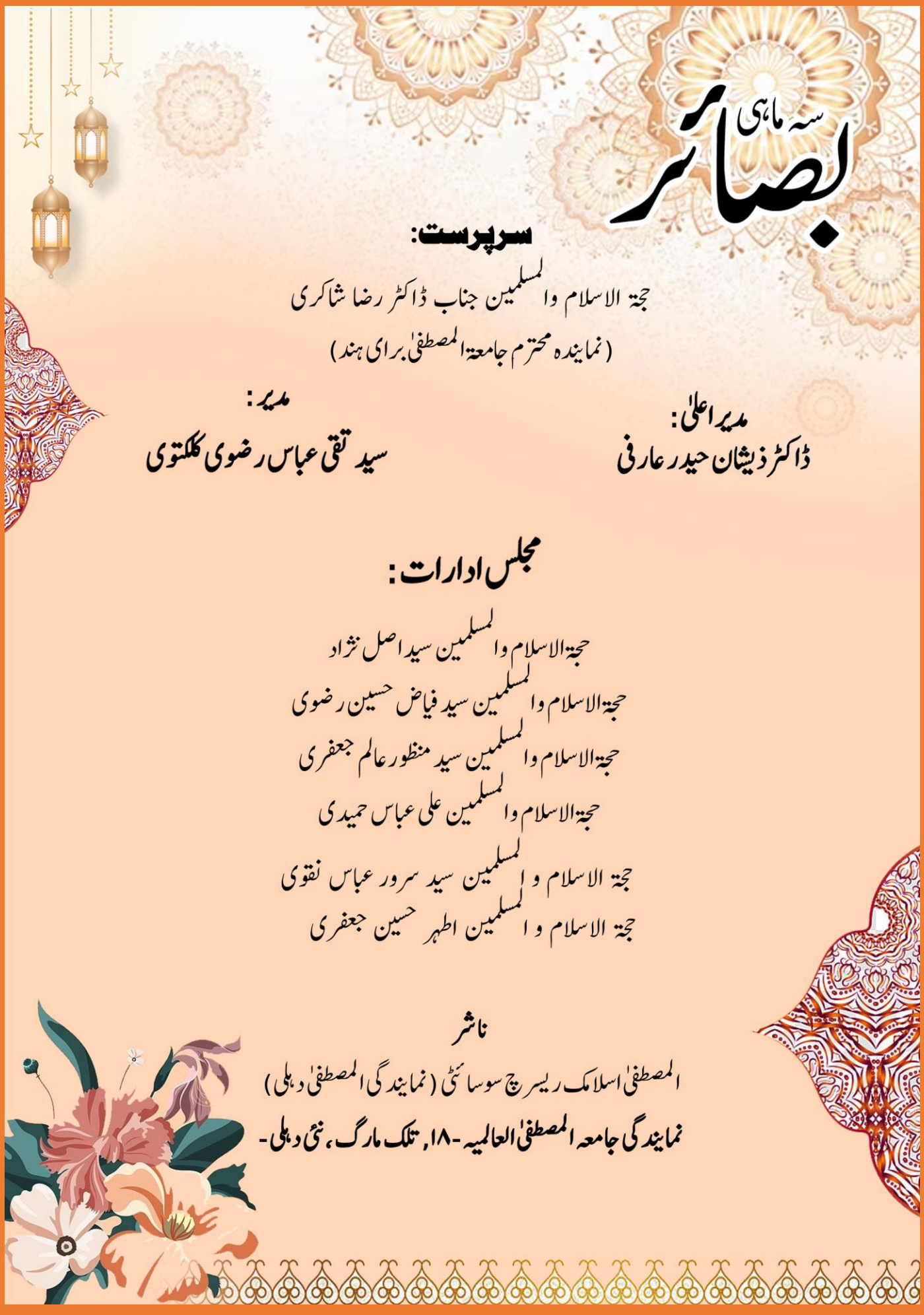

سہ ماہی بصائر

سرپرست:

حجۃ الاسلام والمسلمین جناب ڈاکٹر رضا شاکری

(نمایندہ محترم جامعۃ المصطفیٰ برای ہند)

مدیر اعلیٰ:

ڈاکٹر ذیشان حیدر عارفی

مدیر:

سید تقی عباس رضوی کلکتوی

مجلس ادارات:

حجۃ الاسلام والمسلمین سید اصل نژاد

حجۃ الاسلام والمسلمین سید فیاض حسین رضوی

حجۃ الاسلام والمسلمین سید منظور عالم جعفری

حجۃ الاسلام والمسلمین علی عباس حمیدی

حجۃ الاسلام والمسلمین سید سرور عباس نقوی

حجۃ الاسلام والمسلمین اطہر حسین جعفری

ناشر

المصطفیٰ اسلامک ریسرچ سوسائٹی (نمایندگی المصطفیٰ دہلی)

نمایندگی جامعہ المصطفیٰ العالمیہ -۱۸, تلک مارگ، نئی دہلی-

فہرست مطالب

- اداریہ:.....ادارہ.....۴
- اسلامی مناسبتیں.....ادارہ.....۵
- ربیع الاول زندگی کی بہار.....حجت الاسلام ڈاکٹر رضا شاکری رئیس نمائندگی جامعۃ المصطفیٰ ۶
- پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں قیادت کے اصول.....علی خضر عمرانی، قم المقدسہ.....۹
- قرآن کریم اور پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ میں دینی اخوت.....محمد تقی رضا، قم.....۱۲
- پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کے علل واسباب.....اطہر حسین جعفری.....۱۵
- مدح محبوبِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم.....ڈاکٹر پیام اعظمی.....۲۱
- اسلامی اتحاد کے تحقق میں کارفرما کچھ بنیادی اسباب.....سجاد ربانی.....۲۲
- حضرت امام جعفر صادقؑ اور فکری جمود سے مقابلہ.....حجۃ الاسلام والمسلمین مہدی پیشوائی.....۲۶
- صادق آل محمد علیہ السلام کا، ثقافتی انقلاب.....منہال رضا خیر آبادی.....۳۴
- امام صادق علیہ السلام اور غالیوں سے مقابلہ کی راہیں.....ترجمہ: فیروز علی بناری.....۳۹
- مدح امام جعفر صادق علیہ السلام .....علامہ ذیشان حیدر جوادی.....۴۶
- کشتۂ اضطراب.....مہدی باقر خان.....۴۷
- امام حسن عسکری علیہ السلام کی سیاسی اور اجتماعی سرگرمیاں.....علی عباس حمیدی.....۴۸
- نوحہ در حال امام حسن عسکری علیہ السلام.....صابر علی عمرانی.....۵۲
- حضرت معصومہ قمؑ کے ایران تشریف لانے کی وجوہات.....ظہور مہدی مولائی.....۵۳
- قرآنِ مجید سے غفلت مسلمانوں کے تنزل وزوال کا باعث..سید تقی عباس رضوی کلکتوی.....۵۶
- تقیہ کی حیثیت تاریخ کے آئینے میں.....سید منظور عالم جعفری سرسوی.....۶۴
- فرقہ ناجیہ متفقہ احادیث کی روشنی میں.....ڈاکٹر ذیشان حیدر.....۷۰
- وضو میں پیروں کا مسح، فریقین کے نظریات کا مختصر تجزیہ ....سید حمید الحسن زیدی سیتاپور.....۸۱
- اسلام اور ہندوازم میں صلح وامنیت.....سید محمد مجتبیٰ علی رضوی، کلکتوی.....۹۱
- عید زہرا علیہا السلام.....پیغمبر عباس نوگانوی.....۹۷
- اخباری تراشے.....ادارہ.....۱۰۴

***

اداریہ

خداوند عالم نے اس کائنات کو انسانوں کے لئے مسخر کیا اور ان کو عقل و شعور سے نوازا پھر ان کی ہدایت کے لئے انبیاء، اولیاء اور اوصیا کو بشکل ہادی اور راہنما قرار دیا ان کی عدم موجودگی میں علماء و فضلاء کی ذمہ داری ہے کہ وہ دین کو لوگوں تک پہنچائیں لہذا ہر دور میں مخلص، پر تلاش اور زحمت کش علماء نے دینی تعلیمات کو اپنے وقت کے وسائل اور ذرائع کے ذریعہ لوگوں تک پہنچایا انھوں نے اس کام کے لئے اسکول مدارس اور دیگر دینی مراکز قائم کئے ان ہی علمی مراکز میں سے ایک نمایندگی جامعۃ المصطفیٰ ہے کہ جو اپنے دینی مجلہ ''بصائر'' کے ذریعہ علماء، فضلاء اور محققین کے دینی افکار کو علم دوست افراد کی خدمت میں منتقل کر رہا ہے۔

اس سہ ماہی مجلہ میں ربیع الاول، ربیع الثانی اور جمادی الاول کی مناسبت کے علاوہ دیگر عناوین پر علمی اور تحقیقاتی موضوعات پیش کئے گے ہیں جیسے ''تقیہ کی حیثیت تاریخ کے آئینہ میں'' اس میں مستند اور مدلل دلائل کے کے ذریعہ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تقیہ طول تاریخ میں تمام اقوام میں پایا جاتا رہا ہے لہذا اس کا تعلق کسی خاص فرقہ سے نہیں ہے بلکہ یہ ایک فطری امر ہے۔ اسی طرح مقالہ ''فرقہ ناجیہ متفقہ احادیث کی روشنی میں'' شیعہ سنی روایات کے ذریعہ یہ ثابت کیا گیا ہے فرقہ ناجیہ صرف وہ ہے جو قرآن اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت طاہرین سے تمسک رکھے وہی ''خیر امت'' ہے اور اسی کو دین ناب اسلام کی تبلیغ کا حقیقی حق ہے۔

مقالہ ''وضو میں پیروں کا مسح فریقین کے نظریات کا مختصر جائزہ'' یہ ایک علمی مقالہ ہے جس میں قرآن کریم کی رو سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ''ارجلکم'' خواہ ''ل'' پر فتحہ ہو یا کسرہ دونوں صورتوں میں ''برؤسکم'' پر ہی عطف ہوگا جس کے معنی مسح کے ہیں نیز قریبی لفظ (برؤسکم) کے ہوتے ہوئے دور والے لفظ ''ایدیکم'' پر عطف کرنا قاعدہ کے برخلاف ہے لہذا قرآن اور احادیث سے مسح پا ثابت ہے نہ ان کا دھونا پیروں کو دھونے والی روایات نص قرآن اور دیگر صحیح احادیث کے مخالف ہیں لہذا ہر حال میں قرآنی دلیل کو مقدم کیا جائے گا۔

مقالہ ''قرآن مجید سے غفلت مسلمانوں کے تنزل و زوال کا باعث'' میں اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ آج مسلمان جس پستی اور تنزلی کا شکار ہیں وہ ان کے قرآن اور اسکے دستورات سے روگردانی کا سبب ہے اگر آج مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ وہ دین اور دنیا میں پیشرفت کریں تو قرآن کو سیکھیں اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں۔

مقالہ ''اسلام اور ہندوئیزم میں صلح وامنیت'' میں اس بات کو پیش کیا گیا ہے کہ اسلام اور ہندوئیزم دونوں مذہب صلح و صفا کی دعوت دیتے ہیں اور اختلاف نظر کے باوجود آپس میں میل اور محبت سے زندگی بسر کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ تمام مقالات اپنی اپنی جگہ علمی مطالب سے مملو ہیں امید ہے قارئین ان کو غور سے مطالعہ فرمائیں گے اور مجلہ کی پیش رفت کے لئے اپنے اہم مشورتی نکات سے مطلع فرمائیں گے

آخر میں رب قدیر سے دعا گو ہیں کہ وہ نمایندگی جامعۃ المصطفیٰ میں تمام خدمت کرنے والے اور **مجلہ بصائر** میں علمی، فکری اور تحقیقاتی امور میں تعاون کرنے والے تمام افراد کو اپنے حفظ وامان میں رکھتے ہوئے ان کی توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے۔ آمین

اسلامی مناسبتیں

- **ماہ ربیع الاول**
- ا ربیع الاول /لیلۃ المبیت (سنہ ا ہجری)
- ۵ ربیع الاول سنہ /وفات حضرت سکینہؑ
- ۸ ربیع الاول /شہادت امام حسن عسکری علیہ السلام (سنہ ۲۶۰ ہجری)
- ۹ ربیع الاول /امام زمانہ (عج) کی امامت کا آغاز (سنہ ۲۶۰ ہجری)
- ۱۰ ربیع الاول /رسول خدا (ص) کا حضرت خدیجہ سے نکاح (بعثت سے ۱۵ سال قبل)
- ۱۷ ربیع الاول /رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت (ایک عام الفیل)

ولادت امام صادق علیہ السلام (سنہ ۸۳ ہجری)

- ۲۳ ربیع الاول /فاطمہ معصومہؑ کا شہر قم میں داخلہ (سنہ ۲۰۱ ہجری)

- **ماہ ربیع الثانی**

ا ربیع الثانی /شہادت امام باقر علیہ السلام (ایک قول کے مطابق) (سنہ ۱۱۴ ہجری)

۴ ربیع الثانی /ولادت عبد العظیم حسنیؑ (سنہ ۱۷۳ ہجری)

۸ ربیع الثانی /ولادت امام حسن عسکری علیہ السلام (سنہ ۲۳۲ ہجری)

۱۰ ربیع الثانی /وفات فاطمہ معصومہ سلام اللہ علیہا (سنہ ۲۰۱ ہجری)

۲۲ ربیع الثانی /وفات موسی مبرقع فرزند امام محمد تقیؑ (سنہ ۲۹۶ ہجری)

۲۸ ربیع الثانی /وفات علامہ امینی (سنہ ۱۳۹۰ ہجری)

- **ماہ جمادی الاول**

۵ جمادی الاول /ولادت حضرت زینب کبری (سنہ ۵ ہجری)

۱۵ جمادی الاول /ولادت امام زین العابدین (سنہ ۳۸ ہجری)

۱۳ جمادی الاول /شہادت حضرت زہراؑ (سنہ ۱۱ ہجری)

ربیع الاول زندگی کی بہار

حجت الاسلام والمسلمین ڈاکٹر رضا شاکری/رئیس غانند کی جامعۃ المصطفیٰ

ربیع الاول کا مہینہ ایک کامل اور اکمل انسان کی ولادت کا مہینہ ہے اس ماہ میں اس ذات والامقام کی ولادت ہوئی جو نبیوں کا سردار اور ان کی زینت ہے جس کی وجہ سے خداوند متعال نے عالم ہستی کو طرح طرح کی مخلوقات سے مزین فرمایا یہ وہ عظیم ہستی ہیں جن کی تربیتی سلسلے میں امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہما السلام نے فرمایا: اللہ نے آپ ﷺ کی تربیت کے لئے شروع ہی سے ایک ملک مقرب کو ان کے ہمراہ قرار دیا جو خدا کی جانب سے آپ ﷺ کو اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتا تھا جس کو سرور کائنات نے "ادبنی ربی" (میرے پروردگار نے میری تربیت کی) سے تعبیر کیا ہے۔

خداوند متعال نے تربیت کے بعد "وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ"[1] (اور آپ بلند ترین اخلاق کے درجہ پر ہیں) کہہ کر آپ ﷺ کے عالی ترین اخلاق پر فائز ہونے کی سند دی جس کا مظاہرہ آپ ﷺ نے بعثت سے قبل کافروں کے سامنے ایسا کیا کہ وہ بھی آپ ﷺ کو صادق اور امین کے لقب سے یاد کرتے اور معتمد سمجھ کر اپنی امانتوں کو آپ کے سپرد کرتے تھے حتی شب ہجرت جب آپ ﷺ مدینہ جانے لگے تو ان کی امانات کو حضرت علی علیہ السلام کے حوالے فرما گئے تا کہ ان کو واپس کرنے کے بعد آپ سے مدینہ آکر ملیں۔

آپ ﷺ کی ذات تمام خوبیوں کا مرکز تھی اور ہر عیب سے پاک تھی اسی لئے خدا نے آپ ﷺ کو تمام دنیا کے انسانوں کے لئے خاص طور سے مسلمانوں کے لئے آئیڈیل قرار دیا: "لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ"[2] مسلمانو! تمہارے لئے رسول کی زندگی بہترین نمونہ عمل ہے۔۔۔

اسی طرح یہ مہینہ پیغمبر گرامی ﷺ کے نواسہ اور آپ ﷺ کے چھٹے جانشین حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ولادت کا مہینہ ہے۔ کہ جنہوں نے عالم اسلام پر علم کی وہ چھاپ چھوڑی کہ عالم آل محمد کا لقب پایا جن کے محضر سے ہزاروں دوست اور دشمن افراد نے کسب فیض کیا حتی امام ابو حنیفہ نے ان سے دو سالہ شاگردی پر ان الفاظ میں خوش بختی کا اظہار کیا "لولا سنتان لهلك النعمان" اگر دو سال امام صادق علیہ السلام کی شاگردی سے فیضیاب نہ ہوتا تو نعمان (ابو حنیفہ) ہلاک ہو جاتا[3]

امام مالک نے امام ابو حنیفہ سے اور امام شافعی نے امام مالک سے اور امام احمد بن حنبل نے امام شافعی سے کسب تلمذ کیا لہذا ائمہ اربعہ بلاواسطہ یا بالواسطہ سب امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگرد ہیں۔

مالک بن انس نے کہا: ما رأيت أفقه من جعفر بن محمّد۔ میں نے جعفر ابن محمد سے بڑا فقیہ نہ دیکھا[4]

---

[1] سورہ قلم ۴

[2] سورہ احزاب ۲۱

[3] مختصر التحفۃ الاثنی عشرۃ لشاہ عبد العزیز غلام حکیم الدہلوی، ص ۸

[4] ۔ مناقب أبی حنیفۃ للموفق ج ۱، ص ۱۷۳، و جامع أسانید أبی حنیفۃ ج ۱، ص ۲۵۲، و تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۱، ص ۱۵۷

وما رأت عين ولا سمعت أُذن ولا خطر على قلب بشر أفضل من جعفر بن محمّد الصادق علماً وعبادة وورعاً. جعفر ابن محمد سے افضل، عبادت گذار اور پرہیز گار نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی کے دل میں (ان سے بہتر) تصور آیا[1] نیز کہتے ہیں: فما كنت أراه إلّا على إحدى ثلاث خصال: إمّا مصلّياً وإمّا صائماً وإمّا يقرأ القرآن، وما رأيته قطّ يحدث عن رسول الله إلّا على الطهارة، ولا يتكلّم بما لا يعنيه، وكان من العلماء العبّاد والزهّاد الذين يخشون الله[2]

مالک ابن انس مزید کہتے ہیں: میں جب بھی آپؑ کی خدمت میں شرفیاب ہوا تو ان کو تین حالتوں میں سے کسی ایک پر پایا نماز کی حالت میں یا روزہ کی حالت میں یا قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے اور میں نے ان کو کبھی طہارت کے بغیر رسول خدا کے بارے میں کلام کرتے نہ دیکھا اور اسی طرح بے معنی اور لغو کلام ان کی زبان مبارک سے نہ سنا وہ عابد ترین علماء اور زاہد ترین خدا ترس افراد میں سے تھے.

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کو مختلف علمی شعبوں میں پروان چڑھایا کسی کو علم لغت تو کسی کو فقہ، کسی کو عقاید اور مناظرہ میں حتی آپ کے شاگرد جابر ابن حیان کو کیمسٹری کا ماہر بنایا جن کو آج "بابای کیمیا" کے لقب سے جانا جاتا ہے.

ایک طرف یہ مہینہ ان دو عظیم ہستیوں کی ولادت سے مزین ہے تو دوسری جانب خورشید امامت ابو الائمہ امیر المومنین علی علیہ السلام کی اس کارکردگی سے اس کی ابتدا ہوتی ہے کہ جس کو انھوں نے "لیلۃ المبیت" (شب ہجرت) میں رسول خدا کے بستر پر لیٹ کر ختمی مرتبت پیغمبر اکرم ﷺ کی جان کی حفاظت کر کے انجام دیا اور ایک انوکھے انداز میں اپنی جانثاری کا ایسا اظہار کیا کہ خداوند حکیم و کریم نے ملائکہ کے سامنے مولائے متقیان حیدر کرار علی مرتضیٰؑ پر فخر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے سرہانے کی جانب جبرئیل امینؑ اور پائنتی کی طرف مکائیلؑ جیسے فرشتوں کو حفاظت کے لئے نازل کیا جنھوں نے نزول کے بعد آپ کو مبارکباد پیش کی اور خدا کے ان پر مباہات کا ذکر کیا جس کو قرآن حکیم نے یوں ذکر کیا ہے.

وَمِنَ النّاسِ مَن يشري نَفسَهُ ابتِغاءَ مَرضاتِ الله و اللهُ رَئوفٌ بالعباد[3] اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو اپنے نفس کو مرضی پروردگار کے لئے بیچ ڈالتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے.

آج بھی آپ کی یہ جانثاری اور فداکاری تمام محبان دین کے لئے نمونہ ہے کہ جس سے آپؑ نے تمام محبان رسول اور عاشقان اسلام کو یہ درس دیا کہ عشق و محبت صرف دعوی نہیں ہے بلکہ اپنے رہبر اور محسن کے تحفظ کے لئے تلواروں کے سایہ میں اطمینان اور چین کی نیند سو جانا کمال ہے.

---

[1] تہذیب التہذیب للحافظ ابن حجر العسقلانی ج ۲، ص ۱۰۴

[2] مالک بن انس للخولی ص ۹۴، کتاب مالک لمحمد أبو زہرۃ ص ۲۸، نقلاً عن الدارک للقاضی عیاض ص ۲۱۲

[3] بقرہ ۲۰۷

لہذا یہ وہ مہینہ ہے جس کو رسول خدا ﷺ اور امام صادق علیہ السلام کی ولادت باسعادت اور حضرت علی علیہ السلام کی فداکاری، نے چار چاند لگادیئے جس کی وجہ سے اس مہینہ میں حیات بشری کا مفہوم سمجھ میں آیا .

اہل معرفت اور اہل سلوک نے اس کو ''ماہ زندگی'' سے یاد کیا اس بنا پر ہمارے لئے یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ اس مہینہ میں تمام برکات و نعمات کا سرچشمہ ان ہی کی ذات والا مقام ہے.

جس اسلام کو ہم اپنے لئے اور پوری انسانیت کے لئے وسیلہ نجات جانتے ہیں انہیں ذوات قدسیہ کا مرہون منت ہے.

خداوند کریم سے دعا ہے کہ وہ ہم کو اس ماہ کی فضیلت درک کرنے کے ساتھ اپنی عبادات اور طاعات کی توفیق عطا فرمائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں قیادت کے اصول

علی خضر عمرانی، قم المقدسہ

قیادت اور رہبری ایک ایسا موضوع ہے کہ جس پر عالم انسان کی توجہ کثرت کے ساتھ رہی ہے دنیا کی اہم شخصیات نے قیادت کی کیا تعریف ہے؟ اس کے کیا اصول ہیں؟ قائد رہبر کیسا ہو؟ اس کے اندر کن صفات کا ہونا ضروری ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔۔۔

مختلف افراد نے ان تمام چیزوں پر اپنی اپنی رائے پیش کی ہے۔

اسی وجہ سے قیادت اور قائد کی تعریف میں مختلف آراء دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان تمام آراء کو سامنے رکھتے ہوئے قیادت کی تعریف اس کو سمجھنے کا جو معیار ہے وہ شناخت انسان کی طرف پلٹتا ہے۔

یعنی جو شخص انسان کی جیسی تعریف کرے گا، وہ جس طریقہ سے انسان کو سمجھے گا پھر رہبری کی بھی تعریف اسی بنیاد پر کرے گا۔ لہذا جنھوں نے انسان کو فقط ایک جانور کی حیثیت بخشی ہے اور کہا کہ انسان فقط ایک اجتماعی میں رہنے والا جانور ہے وہ رہبری اور قیادت کی تعریف بھی ایسی ہی کرتے ہیں ان کے نزدیک یعنی انسان کی تمام خواہشات کو پورا کرنا چاہے وہ حلال ہوں یا حرام ہوں۔

لیکن اسلام چونکہ انسان کی قداست اور کرامت کا قائل ہے، اور اسے اشرف المخلوق کا درجہ دیتا ہے لہذا اسلام کی نظر میں رہبری کی تعریف بھی الگ ہے۔

اسلامی حکومت جس کا آغاز پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قیادت اور ان کی رہبری میں ہوتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس اسلامی حکومت کے پہلے حاکم ورہبر ہیں، آپ کی سیرت سے رہبری کے اسلامی اصول کو اخذ کیا جاسکتا ہے۔ لہذا پیش نظر مقالہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصول رہبری کو بیان کیا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اس قدر عمیق ہے اور اس قدر خوبصورت ہے کہ آپ کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے اور جزئی پہلو سے بھی درس کا ایک باب آمادہ کیا جاسکتا ہے اور زندگی جینے کے اصول تیار کئے جاسکتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد مدینہ منورہ میں خداوند متعال کے حکم سے پہلی اسلامی حکومت تشکیل دی اور خود آپ اس اسلامی حکومت کے رہبر و حاکم بنے اور تقریباً دس سال تک آپ اسلامی حکومت کے حاکم رہے معاشرہ کی قیادت آپ کے مبارک ہاتھوں میں رہی اور یوں عالم اسلام آپ کے فیوضات سے بہرمند ہوتا رہا۔

ہم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس دس سالہ زندگی اور حکمرانی سے رہبری کے چند اصول کو اخذ کیا ہے۔

ا۔ قائد و رہبر معاشرہ کا افضل ترین شخص ہونا چاہئے:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ میں قیادت کے اصول میں سے ایک اصل یہ ہے کہ رہبر معاشرہ کا فاضل ترین شخص ہونا چاہئے یعنی قیادت اس کو سونپی جائے جو انسانی صفات کے لحاظ سے کامل اور افضل ہو۔

خود پیغمبر اسلام ﷺ نے پہلی اسلامی حکومت کی باگ ڈور سنبھال کر بتلادیا کہ یہ نکتہ بہت اہم ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ رہبر اور لیڈر ایک جوان شخص کو ہونا چاہئے چونکہ جوانوں کے اندر جذبہ زیادہ ہوتا ہے لہذا معاشرہ کی قیادت اچھے سے کر سکتا ہے یا بعض لوگوں کے نزدیک رہبر سن کے لحاظ سے بڑا ہونا چاہئے جیسا کہ عالم اسلام نے اس طرح کے افراد پا گئے اور اس طرح کی سوچ سے عالم اسلام نے ایک کاری ضرب بھی کھائی۔

لہذا پیغمبر اسلام ﷺ کی نظر میں عمر اور سن رہبری اور قیادت کیلئے معیار نہیں ہے۔ بلکہ معیار انسانی اقدار ہیں۔ خود مولائے متقیان حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو اپنے بعد اپنا جانشین مقرر کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ پیغمبر کی نگاہ میں عمر اور سن قیادت کا معیار نہیں ہے۔ بلکہ معیار معاشرہ میں جو شخص بھی انسانی صفات کے اعتبار سے سب سے افضل اور کامل ہوگا وہ معاشرہ کا رہبر اور لیڈر ہوگا۔

۲۔ رحمت اور محبت

ایک لیڈر کی کامیابی اور موثر ہونے کا راستہ اس کا نرم دل اور رحم دل ہونا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کو خداوند متعال نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ اپنے حکومتی امور میں اس نکتہ کی بہت زیادہ رعایت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ پیغمبر اسلام ﷺ سے شدید محبت کرتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل نہ ہوتے اور پیغمبر اسلام کے اتنے گرویدہ نہ ہوتے۔

آپ کی محبت اور رحمت نے کئی سارے مسائل جن کا حل ہونا مشکل اور ناممکن معلوم ہوتا تھا، ان مسائل کو حل کیا ہے اس کا ایک نمونہ فتح مکہ کے موقع پر دیکھنے کو ملتا ہے۔

اسلامی فوج نے ۲۰ر سال کی سختیوں اور مشکلات کے بعد بغیر کسی خونریزی کے مکہ کو فتح کیا تھا پیغمبر اسلام ﷺ کی رحمت نے خطرناک دشمنوں کے دلوں پر بھی اپنا سکہ جمالیا تھا اور سخت ترین دشمن بھی آپ ﷺ سے مانوس ہوگئے تھے۔

پیغمبر ﷺ نے ان سے کہا کہ ''اے مکہ کے رہنے والوں تم نے مجھے تکلیف پہنچائی، مجھے جھٹلایا اور مجھے مکہ سے باہر نکال دیا، کیا سوچ رہے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیسا برتاؤں کروں گا؟ جیسے ہی لوگوں نے کہا کہ ہم آپ سے رحمت کے سوا کسی اور چیز کے منتظر نہیں ہیں تو آپ نے سورہ یوسف کی چند آیات کی تلاوت فرمائی کہ جسمیں جناب یوسفؑ کا ان کے بھائیوں کے ساتھ رفتار کا تذکرہ تھا اور اس طرح آپ ﷺ نے اپنی رحمت کے ذریعہ لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کی کہا کہ جاؤں تم آزاد ہو۔

۳۔ عہد و پیمان کا پابند

ایک لیڈر اگر چاہتا ہے کہ وہ کامیاب لیڈر اور رہبر ثابت ہو تو اسے چاہئے کہ وہ جو وعدہ اور عہد و پیمان اپنی رعایا سے کرتا ہے انھیں نبھائیں اور ان وعدوں کی وفا کرے۔ چونکہ عہد و پیمان کی وفا نہ کرنا لوگوں سے رہبری پر اعتماد کو ختم کر دیتا ہے اور اگر لوگوں کو ایک لیڈر سے اعتماد ختم ہو جائے تو یہ بے اعتمادی اس کی حکومت کے تزلزل کا سبب بنتی ہے اور پھر معاشرہ میں سستی اور بے نظمی عام ہو جاتی ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ اپنے کارندوں اور حکمرانوں کو بارہا تذکر دیا کرتے تھے کہ اپنی رفتار و گفتار میں امانت اور صداقت اور وعدہ کو وفا کرنے کا خاص خیال رکھیں اور خیانت سے پرہیز کریں۔ مثال کے طور پر آپ نے اپنے خط میں جو آپ نے معاذ بن جبلؓ کو یمن کی کمانڈری سونپتے ہوئے اس بات کی سفارش کی تھی۔

۴۔ لوگوں سے ڈائرکٹ رابطہ رکھنا

ایک کامیاب لیڈر وہ ہے جو لوگوں اور اپنی رعایا سے مستقیماً رابطہ رکھے۔ یعنی کسی امتیاز کا قائل نہ ہو وہ یعنی خود کو سب سے جدا نہ سمجھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ سلاطین زمان کے اٹھنے بیٹھنے، ان کی آؤ بھگت سے سختی سے بیزار تھے یعنی آپ اس وقت کے رائج امتیازات کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ آپ ﷺ نے اپنے گھر میں کچھ اوقات لوگوں سے ملاقات کیلئے مخصوص کر رکھے تھے۔ آپ ﷺ کی حکمرانی اور قیادت کا ایک اصول یہ ہے کہ حکمران اور عوام میں فاصلہ نا کے برابر ہو۔

لہذا آپ ﷺ کی زندگی سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ اور آپ کے حقیقی جانشین فقراء اور مساکین کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے، ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور ان کی عیادت کیلئے جاتے وغیرہ وغیرہ

اس سے یہ نکتہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ کی نگاہ میں خلیفہ و رہبر لوگوں سے مستقیماً رابطہ رکھے۔

اس کے علاوہ اور بھی نکات ہیں جن کو اس مختصر مقالہ میں ذکر نہیں کیا جاسکتا ہے لہذا ہم ان چند ہی اصول پر اکتفا کرتے ہیں۔

آخر میں خدا سے دعا گو ہیں کہ خداوند متعال حضور ﷺ کے آخری جانشین، ہمارے حقیقی اور الہی رہبر امام مہدی علیہ السلام کے ظہور میں تعجیل فرمائے تاکہ دنیا اسلامی حکومت کے مکمل اور کامل عروج کو دیکھ سکے جس کا خداوند متعال نے وعدہ فرمایا ہے اور جس کے لئے آپ ﷺ کو مبعوث فرمایا تھا:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا[1]

[1] سورہ فتح ۲۸

قرآن کریم اور پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ میں

دینی اخوت اور برادری کی اہمیت ہے

محمد تقی رضا، قم

خداوند متعال اس دنیا میں انسان کو کمال تک پہنچانے کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا تاکہ وہ اپنے اعلی اخلاق اور احکام الہی کے ذریعے انسان کو سعادت تک پہنچائیں۔

کمال کی طرف حرکت کا ایک پہلو دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک ہے۔ غالبا جب لوگ ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو ایک دوسرے کو دوست کا لقب دیتے ہیں ایک دوسرے کو دوست ماننے لگتے ہیں لیکن اسلام نے لوگوں کی دوستی اور محبت کے تعلقات کو اتنا بڑھادیا کہ اسلامی معاشرے میں موجود افراد، ایک دوسرے کے دوست نہیں بلکہ ایک دوسرے کے بھائی کہلاتے ہیں قران کریم مومنین کے بارے میں فرماتا ہے «انما المومنون اخوۃ» [1] مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

اسلام میں فرق نہیں کرتا کہ کون کس قبیلے، کس نسل اور کس ملک سے ہے، اس کی عمر کتنی ہے، اس کی زبان کیا ہے، اس کا رنگ کیسا ہے بلکہ وہ جیسا بھی ہو اگر اسلام کے دائرہ میں ہے تو سب کے جیسا ہے اور سب مسلمانوں کے برابر ہے، دین اسلام میں بہتر ہونے کا معیار صرف تقوا ہے، اس معیار سے ہٹ کر سب برابر ہیں۔

اسلام نے ایک بڑی فیملی تشکیل دی ہے جو بھی اسلام قبول کرے گا وہ اس فیملی کی فرد ہوگا اس فیملی میں سب کے لئے یکساں فرائض ہیں۔

کسی ایک کی خوشی سب کی خوشی مانی جائے گی، مذکورہ آیت سے ہمیں اتحاد و ہمبستگی کا پیام سمجھ میں آتا ہے جس کا ایک روشن اور واضح مصداق نمونہ حج ہے ہم حج کے موقع پر دیکھتے ہیں کہ مختلف جگہوں سے مختلف کلچر کے مسلمان آتے ہیں لیکن اسلام نے سب کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا ہے، جو توحید، نبوت اور معاد کے مشترکہ عقیدہ کے ماتحت ایک پرچم تلے جمع ہوتے ہیں اب یہاں پر کسی میں بھی فرق نہیں ہوتا یہ سب خانہ خدا کے طواف اور خدا کی اطاعت کے لیے آئے ہیں۔ جو سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

یہ اخوت و برداری صرف زبانی نہیں بلکہ عمل میں بھی دکھائی دینی چاہیے احادیث میں اس مسئلے پر بہت تاکید ہوئی ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے «المسلم اخو المسلم لا یظلمه ولا یخذله ولا یسلّمه» مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اس پر ظلم نہیں کرتا اسے خوار و ذلیل نہیں کرتا اور اسے حوادث کے مقابلے میں اکیلا نہیں چھوڑتا۔

---

[1] سورہ حجرات آیت ۱۰

ایک دوسری حدیث میں حضرت ارشاد فرماتے ہیں «مثل الاخوین مثل الیدین یغسل احدھما الاخری» دو بھائیوں کی مثال دو ہاتھوں کی جیسی ہیں جیسے کہ ایک ہاتھ دوسرا ہاتھ کو دھوتا ہے، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جیسے ایک ہاتھ دوسرا ہاتھ کو دھوتا ہے اور اسے گندا نہیں رہنے دیتا، ویسے ہی ایک مسلمان اپنے مسلمان اور مومن بھائی کی اصلاح کرتا ہے اور اس کے عیب و نقص کو مٹاتا ہے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ نہ اس میں کوئی عیب ہو اور نہ اس کے بھائی میں کوئی عیب ہو۔

اور بہت ساری روایات میں مومن بھائی کے حقوق بیان کیے گئے ہیں جیسے کہ مومن بھائی کے ساتھ مصافحہ ملانا، معانقہ کرنا، اس کو یاد کرنا، اس کو خوش کرنا، اس کے خواہشوں کو پورا کرنا، اس کے غموں کو دور کرنا، اس کو کھانا کھلانا، کپڑے پہنانا، اس کا احترام کرنا، اور بہت سارے حقوق جو کتاب شریف اصول کافی میں موجود ہیں۔

ایک جامع حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے مومن کے ۳۰ حقوق گنوائے ہیں لیکن مقالے کے اختصار کی وجہ سے ہم دوسری حدیث بیان کرتے ہیں جس میں پیغمبر اکرم مومن بھائی کے سات حقوق کی طرف اشارہ فرماتے ہیں پیغمبر اکرم فرماتے ہیں مومن دوسرے مومن پر خدا کی طرف سے سات حق رکھتا ہے

۱) احترام یعنی مومن دوسرے مومن کو خود سے اونچا سمجھیں

اس لئے اسلام میں کسی کو کسی پر برتری نہیں ہے شیطان اسی برتری کے تصور سے قیامت تک لعنتی قرار پایا کیوں کہ اس نے اپنے کو حضرت آدمؑ سے بہتر سمجھا جس کی بنا پر اس نے حکم خدا کی نافرمانی کی اور حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سر بسجود نہ ہوا اور جب خدا نے پوچھا تو جواب دیا کہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اس کو مٹی سے پیدا کیا جبکہ میں اس سے بہتر ہوں جس کی بنا پر خداوند متعال نے اس کو ملائکہ کی بزم سے خارج کر دیا تو برتری کا احساس انسان کو متکبر اور خدا کا نافرمان بنا دیتا ہے۔

۲) محبت یعنی مومن دوسرے مومن کو اپنے دل سے دوست رکھیں۔

ایسی محبت کہ جو اپنے لئے پسند کرے اس کے لئے پسند کرے اگر مشکلات میں گھر جائے تو اس کی سپر بن جائے مریض ہو جائے تو اس کی عیادت کے لئے جائے کسی چیز کی ضرورت ہو اس کے لئے مہیا کرنے کی کوشش کرے

۳) مواسات یعنی اپنے مال اور اموال میں اس کو شریک کرے۔

۴) حمایت یعنی جب اس کی عدم موجودگی میں دوسرے اس کی برائی کر رہے ہوں تو اس کی حمایت کرے

کسی نے بزم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کسی صحابی کی عدم موجودگی میں تنقید کی تو دوسرے صحابی نے اس سے دفاع کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دفاع کرنے والے صحابی کو سراہا جس سے آپ دوسرے افراد کو یہ درس دیا کہ مومن کو چاہیے کہ وہ اپنے بھائی کا دفاع کرے اور اس کے کام صحیح توجیہ کرے۔

۵) عیادت یعنی جب مومن بھائی مریض ہو جائے تو اس کے عیادت کے لیے جائے۔

امیر مومنان علی بن ابی طالب علیما السلام مریض کی عیادت کی اہمیت کے بارے میں فرماتے ہیں: "من احسن الحسنات عیادۃ المریض "بہترین اعمال میں سے بہترین عمل مریض کی عیادت ہے[1] حضور کی سیرت طیبہ میں ہے کہ آپ ہمیشہ بیماروں کی عیادت فرماتے تھے[2]

۶) تشییع یعنی مومن کے تشییع جنازے میں شرکت کرے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

جو (مومن) کسی (مومن کے) جنازہ کی تشییع کرتا ہے اس کے واپس پلٹنے تک ایک دس کروڑ نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہیں اور دس کروڑ گناہ مٹائے جاتے ہیں اور وہ خدا کے نزدیک دس کروڑ مراتب کو حاصل کرتا ہے اور اگر نماز بھی پڑھ لے تو اس کی موت کے وقت دس کروڑ ملائکہ اس کی تشییع جنازہ اور اس کے لئے استغفار کریں گے اور اگر وہ دفن میں بھی شریک ہوگا تو خداوند متعال ایک لاکھ فرشتوں کو مامور کرے گا تاکہ وہ قیامت تک اس کے لئے استغفار کریں[3]

البتہ اس کا مطلب یہ کہ اگر انسان دیگر دوسرے شرائط جیسے ایمان، ولایت اہل بیت وغیرہ کے ساتھ اس عمل کو انجام دے تو وہ اتنے عظیم ثواب کو درک کرسکتا ہے۔

۷۔ نیکیوں سے یاد کرنا یعنی مومن کے مرنے کے بعد اس کو صرف نیکی سے یاد کرے۔

ان سب روایات سے سمجھ میں آتا ہے کہ انسان جب تک کمال تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے حقوق کی رعایت نہ کرے اب ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ ہم کتنا اپنے بھائی کے حقوق کی رعایت کرتے ہیں۔ جب تک ان حقوق کی رعایت نہیں ہوگی جب تک ہم کمال تک نہیں پہنچیں گے چاہے ہمارے دوسرے کام صحیح کیوں نہ ہو۔

[1] مستدرک الوسائل میرزا حسین نوری موسسہ آل البیتؑ قم چاپ اول ج ۲ ص ۲

[2] مکارم اخلاق حسن بن فضل طبرسی، شریف رضی قم چاپ چہارم ۱۴۱۲ق ص ۱۲

[3] حر عاملی، وسایل الشیعہ، ۱۴۰۹ق، ج ۳، ص ۱۴۳ و ۱۴۴، باب ۲، حدیث ۶.

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کے علل و اسباب

اطہر حسین جعفری

مکہ حرم الٰہی اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مبارک وطن ہے، اور آپ ۵۳ سال کی عمر میں بعثت کے ۱۳ سال بعد اس شہر کو چھوڑ کر یثرب (مدینہ) کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ ہجرت خداوند متعال کے حکم سے تھی لیکن جو چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کا باعث بنیں ان میں سے چند کا ذکر ہم اختصار کے ساتھ پیش کر رہے ہیں

ا۔ مکہ کی صورت حال:

پیغمبر اکرم (ص) ۴۰ سال کی عمر میں مبعوث بہ رسالت ہوئے؛ لیکن ابتدائی تین سالوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مخفی طور پر تبلیغ کی اور پھر آشکارا طور پر دس سال مکہ میں تبلیغ کی۔ ہر سال حج کے موقع پر رسول اکرم بھیڑ بھاڑ والے علاقوں مثلا مشعر، عکاظ، ذی المجاز اور مجنّہ کے بازاروں میں حاجیوں کے پاس جاتے اور انہیں اسلام کی دعوت دیتے؛ لیکن چند افراد کے علاوہ کسی نے ان کی آواز پر لبیک نہیں کہی۔

اس کی دو بنیادی وجوہات تھیں: ایک، ابولہب کی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف منفی تبلیغات اور دوسری اہل مکہ کا مزاج۔

آپ کے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی وجہ اس وقت اور واضح ہو جائے گی جب آپ ان دونوں شہر کے حالات کا سرسری طور پر جائزہ لیں گے ہم جب بعثت کے ابتدائی ۱۳ سالوں کا اہل مکہ و اہل مدینہ کے درمیان مقایسہ کرتے ہیں تو کچھ بنیادی فرق سامنے آتے ہیں:

الف) مکہ کے اکثر افراد متکبر، متشدد، ضدی، متعصب اور دنیا پرست تھے؛ لیکن مدینہ کی اکثریت متواضع، غیرت مند، سچے، غیر متعصب اور نسبتا متمدن لوگوں پر مشتمل تھی اس لئے قرآن نے اہل مدینہ کے درمیان تیزی سے اپنی جگہ بنالی اور ان کے پاک دلوں کو اپنی تعلیمات سے روشن کیا، حاکم نیشاپوری کا کہنا ہے: "فانّها فتحت بالقرآن" مدینہ قرآن کے ذریعے فتح ہوا۔

ب) مکہ کے لوگ اور بالخصوص ان کے بڑے افراد، تاجر، ثروت مند اور سود خور تھے اور اسلام کو اپنے مفادات کے لئے خطرہ سمجھتے تھے جب کہ مدینہ کے لوگ مزدور، کسان، زحمت کش اور متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اسی لئے اسلام ان کے مفادات کے لئے خطرہ نہیں تھا۔

ج) مکہ کے اکثر افراد عیاش، بدکار، بدتمیز، فحش اور ایسی اخلاقی برائیوں میں ملوث تھے کہ جنہیں اسلام حرام سمجھتا ہے؛ لیکن مدینہ کی اکثریت پاک و پاکیزہ اور فحشاء و منکرات میں سے دور تھی لہذا ان کے تمدن اور اسلام کے درمیان کوئی ٹکراو نہیں تھا۔

د) اہل مکہ کے درمیان توحیدی افکار اور الٰہی ادیان کا تصور بہت کم پایا جاتا تھا اور لوگ ان کے متعلق زیادہ آشنائی نہیں رکھتے تھے؛ لیکن اہل مدینہ یہودیوں سے تعلقات کی بنیاد پر الٰہی ادیان اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور سے باخبر تھے، لہذا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کے وقت ایک دوسرے سے کہتے تھے: "یہ تو وہی رسول ہے جس کے آنے کی خوشخبری یہودی سناتے تھے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس نئے دین کو قبول کرنے میں ہم پر سبقت لے جائیں"۔

ہ) اوس اور خزرج کے دو قبیلوں کے درمیان کئی سالوں سے جاری تباہ کن اور تلخ جنگوں نے اہل مدینہ کو پریشان کر دیا تھا اور وہ اس کا حل تلاش کر رہے تھے کہ ان میں سے ایک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات میں اس کی وضاحت کی۔

مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اہل مکہ کی ثقافتی گراوٹ اور ان میں دشمنی کا جذبہ اور قریش کی جانب سے ایذاء رسانی اور بے انتہا دباو مکہ سے رسول اکرم ﷺ کی ہجرت کے اسباب بنے۔

۲۔ پیغمبر اکرم ﷺ کی محنتیں:

اگرچہ بہت سے مقامات پر قبیلوں کے سرداروں کے ساتھ رسول اکرم کی ملاقات سودمند ثابت نہیں ہوتی تھی؛ لیکن ان ملاقاتوں کا ایک اثر یہ ہوتا تھا کہ مدینہ کے حجاج واپسی پر رسول اکرم ﷺ کے ظہور کو ایک مہم ترین خبر کے عنوان سے مدینہ میں پھیلاتے تھے اور لوگوں کو اس طرف متوجہ کرتے تھے۔ کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے مکہ میں مدینہ کے بہت سے افراد سے ملاقاتیں کیں جس کی بدولت آپ ﷺ کی ہجرت کے لئے زمین ہموار ہوئی، مثلا:

الف) سوید بن صامت نام کا ایک شخص مدینہ سے مکہ آیا۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے اس سے ملاقات کی اور اسلام کے نورانی حقایق سے اسے روشناس کروایا۔ اس نے جواب میں کہا: شاید یہ وہی لقمان کی حکمتیں ہیں جو میرے پاس ہیں۔

پیغمبر اکرم نے فرمایا: لقمانؑ کی حکمتیں اچھی باتیں ہیں، لیکن جو کچھ خدا نے مجھ پر نازل کیا ہے وہ اس سے بہت بہتر ہے؛ کیونکہ یہ نور ہدایت ہے۔

پھر حضور ﷺ نے اس کے سامنے کچھ آیات کی تلاوت کی جو اس پر اثر انداز ہوئیں اور وہ اس حالت میں مدینہ کی طرف واپس پلٹا کہ اسلام کو قبول کر چکا تھا؛ لیکن ہجرت سے پہلے جنگ بغاث میں خزرجیان کے ہاتھوں وہ مارا گیا۔

ب) انس بن رافع قبیلہ بنی اشھل کے کچھ جوانوں کے ساتھ جن میں ایاس بن معاذ بھی تھے، مکہ میں وارد ہوئے۔ ان کا مقصد خزرجیان سے مقابلہ کرنے کے لئے اہل قریش سے مدد طلب کرنا تھا۔ پیغمبر اکرم نے ایک نشست میں ان سے ملاقات کی اور ان پر قرآن کی آیات کی تلاوت کی اور دین اسلام کو ان کے سامنے پیش کیا۔ ایاس جو ایک باشھامت جوان تھے وہ اس ملاقات میں ایمان لے آئے اور انہوں نے کہا: یہ دین قریش کی اس مدد سے بہتر ہے جس کے لئے ہم یہاں آئے ہیں۔ قبیلے کے سرداروں کی اجازت کے بنا اس جوان کا ایمان لے آنا انس کے غصے کا باعث بنا اور اس نے اپنے غصے کو ختم کرنے کے لئے ایاس کے چہرے پر حملہ کرتے ہوئے کہا: خاموش ہو جاو، ہم یہاں قریش سے مدد طلب کرنے آئے ہیں نہ کہ اسلام قبول کرنے۔ اس کے بعد یہ نشست تمام ہو گئی اور یہ گروہ مدینہ کی طرف واپس چلا گیا۔ لیکن اس واپسی کے بعد اوس و خزرج کے قبیلوں کے درمیان جنگ بغاث چھڑ گئی جس میں ایاس مارا گیا۔

ج) پیغمبر اکرم ﷺ اور قبیلہ بنی عامر کے درمیان ہونے والی ملاقات میں بحیرہ بن فراس نامی ایک شخص نے پیغمبر اکرم ﷺ کی طرف اشارہ کر کے کہا: خدا کی قسم! اگر میں اس جوان کو قریش سے لے سکوں تو اس کی بدولت میں سارے عرب کو اپنی مٹھی میں کر سکتا ہوں۔ پھر اس نے رسول خدا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: اگر ہم تمہاری اطاعت کریں اور خدا تمہیں تمہارے مخالفین پر کامیاب کر دے تو کیا تم ہم پر

حکومت مسلط کر دو گے ؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اَلاَمرُ اِلی اللہِ ، یَضَعَہُ حَیثُ یَشاء" یہ کام اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جہاں چاہے گا اسے انجام دے گا۔ اس وجہ سے بحیرہ نے اسلام کو قبول نہیں کیا۔ مذکورہ واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امر امامت ابتداء سے ہی انتصابی ہے۔

د) پیغمبر اکرم ﷺ نے حج کے موسم میں قبیلہ خزرج کے چھ افراد سے ملاقات کی اور ان سے کہا: کیا تم نے یہودیوں کے ساتھ عہد و پیمان کیا ہوا ہے ؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ آنحضرت نے فرمایا: بیٹھو تا کہ تم سے بات کر سکوں۔ وہ بیٹھ کر پیغمبر ﷺ کی بات سننے لگے۔ اس دوران رسول اکرم نے چند آیات کی تلاوت فرمائی رسول اکرم کے فرمودات نے ان ایسا اثر کیا کہ سب اسی نشست میں ایمان لے آئے۔

وہ یہودیوں کی ان باتوں کی وجہ سے اسلام کی طرف آئے جس میں انہوں نے سن رکھا تھا کہ قوم عرب میں سے، آئین توحید کو رائج کرنے والا اور بت پرستی کو ختم کرنے والا ایک پیغمبر بہت جلد مبعوث ہوگا لہذا انہوں نے ایک دوسرے سے کہا ہوا تھا کہ: اس سے قبل یہودی اس پیغمبر کی مدد کو پہنچیں ہمیں اس کی مدد کو جانا ہوگا۔ اس گروہ نے پیغمبر ﷺ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: ہمارے درمیان جنگ شعلہ ور ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ خدا آپ کے پاک آئین کے طفیل اس آگ کو ٹھنڈا کر دے گا۔ ہم یثرب کی طرف واپس جا کے آپ کے دین کی تبلیغ کریں گے۔ ہم سب لوگوں کو اس دین کی طرف بلانے کی کوشش کریں گے اس طرح ان ۶ افراد نے اہل یثرب کے درمیان دین کی تبلیغ کا آغاز کیا۔

ہ) ان چھ افراد کی تبلیغ کا بہت مثبت اثر ہوا جس کی بدولت اہل مدینہ کی ایک قابل ذکر تعداد نے دین مبین کو قبول کیا اور پیمان عقبہ کے لئے میدان فراہم کیا۔ بعثت کے بارہویں سال بارہ افراد کا ایک گروہ مدینے سے رسول اکرم ﷺ سے ملاقات کے لئے عقبہ پہنچے اور رسول اکرم سے ملاقات کی اور اس طرح اسلام کا پہلا پیمان نامہ لکھا گیا۔ ان بارہ افراد میں معروف ترین افراد اسعد بن زرارہ اور عبادہ بن صامت تھے۔ اسلام قبول کرنے کے قبل اس پیمان نامے کا متن اس طرح سے تھا: "ہم نے رسول خدا کے ساتھ یہ عہد باندھا ہے کہ مندرجہ ذیل وظایف پر عمل کریں گے:

شرک نہیں کریں گے، چوری اور زنا نہیں کریں گے، اپنے بچوں کو قتل نہیں کریں گے، ایک دوسرے پر تہمت نہیں لگائیں گے اور برے کام نہیں کریں گے اور نیک کاموں میں نافرمانی نہیں کریں گے"۔

رسول اکرم نے ارشاد فرمایا: اگر تم اس عہد و پیمان کا پاس و لحاظ رکھو تو تمہارا ٹھکانہ جنت ہوگا لیکن اگر نافرمانی کرو گے تو خدا صاحب اختیار ہے چاہے تو سزا دے یا معاف کر دے۔ مورخین کے نزدیک یہ پیمان "بیعۃ النساء" کے نام سے معروف ہے۔ کیونکہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر عورتوں سے بھی اسی طرح عہد لیا تھا۔

یہ بارہ افراد ایمان سے لبریز دل کے ساتھ مدینہ کی طرف واپس پلٹے اور تبلیغ کا آغاز کیا۔ پھر انہوں نے پیغمبر کو خط لکھ کر ان سے مطالبہ کیا کہ ایک مبلغ ان کی طرف بھیجا جائے جو انہیں قرآن کی تعلیم دے پیغمبر اکرم ﷺ ایک اچھی آواز والے جوان مصعب بن عمیر کو ان کی

تعلیم و تربیت کے لئے بھیجا اور اس مبلغ کی تبلیغات کے نتیجے میں مسلمان آپ ﷺ کی غیر موجودگی میں ایک ساتھ جمع ہوتے تھے اور با جماعت نماز پڑھتے تھے۔

و) پیمان عقبہ اول نے دوسرے پیمان کے لئے میدان ہموار کیا۔ کیونکہ یثرب میں مسلمانوں کی تبلیغ نے ایک جوش و جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ مسلمان شوق کے ساتھ اسلامی دستورات پر عمل کرتے تھے اور بے صبری کے ساتھ حج کے موسم کا انتظار کرتے تھے تاکہ اپنے پیغمبر ﷺ کی زیارت کر سکیں۔ حج کا موسم آگیا اور ۷۵ لوگوں پر مشتمل ایک کاروان جس میں ۷۵ لوگ مسلمان تھے مکہ کی طرف چل پڑا۔ اس کاروان کے مکہ پہنچنے کے بعد مسلمانوں نے آپ ﷺ سے ملاقات کی اور بیعت کے لئے وقت کا مطالبہ کیا۔ ۱۳ ذی الحجہ کی آدھی رات کا وقت اور عقبہ منی کا مقام طے پایا۔

طبری کی روایت کے مطابق: یہ نشست عبد المطلب کے گھر میں برگزار ہوئی جو عقبہ سے قریب تھا حضرت علیؑ اور حضرت حمزہؑ عقبہ کے باہر نگہبانی پر مامور تھے ۱۳ کی رات آگئی اور پیغمبر اکرم ﷺ سب سے پہلے اپنے چچا (عباس) کے ساتھ عقبہ کے مقام پر پہنچ گئے مشرکین قریش کے سو جانے کے بعد مسلمان آدھی رات کو خاموشی کے ساتھ مقررہ مقام پر پہنچ گئے پھر عباسؓ نے اہل یثرب سے خطاب کرتے ہوئے کہا: اے اہل خزرج! اگر تم محمد سے کئے گئے وعدوں کو پورا کرنے اور ان سے وفاداری کرنے پر پابند رہ سکتے ہو اور ان کے مخالفین سے ان کی حفاظت کر سکتے ہو تو ہی یہ عہد و پیمان کرو، لیکن اگر وقت آنے پر تم انہیں دشمنوں کے درمیان اکیلا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہونے کا ارادہ رکھتے ہو تو ابھی سے واپس چلے جاو۔

اہل یثرب نے عباسؓ سے وعدہ کرتے ہوئے کہا: ”جو تم نے کہا ہم نے سن لیا۔ اے خدا کے رسول! آپ خود بات کریں اور اپنے اور اپنے خدا کی خاطر ہم سے جو عہد بھی لینا چاہتے ہیں وہ لیں۔ پیغمبر ﷺ نے تلاوت قرآن کے ساتھ اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے انہیں خدا اور دین کی طرف دعوت دی اور فرمایا: "میں تم سے اس بات کی بیعت چاہتا ہوں کہ اسی طرح میرا دفاع کرو گے جس طرح تم اپنے اہل و عیال کا دفاع کرتے ہو"۔ تمام انصار نے حامی بھر لی۔ اسی طرح انہوں نے یہ عہد بھی کیا کہ پیغمبر اکرم ﷺ جسے بھی خلافت بخشیں گے وہ اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔

ابو الہیثم بن تیہان نے کہا: اے خدا کے رسول! ہمارے اور یہودیوں کے درمیان تعلقات ہیں جنہیں ہم ختم کر دیں گے، تو کیا جب خدا آپ کو کامیاب کر دے گا آپ اپنی ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم کی طرف واپس چلے جائیں گے! پیغمبر اکرم ﷺ نے مسکرا کر فرمایا: میرا خون تمہارا خون ہے اور میری حرمت تمہاری حرمت ہے۔ میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو۔ میں اس سے جنگ کروں گا جس سے تم جنگ کرو گے اور اس سے صلح کروں گا جس سے تم صلح کرو گے۔ اس دوران اہل یثرب نے مکمل رضایت کا اعلان کرتے ہوئے رسول اللہ کی بیعت کی پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے درمیان سے ۱۲ لوگوں کا انتخاب کرو جو دوسروں کا خیال رکھیں۔ اس طرح آپ ﷺ نے وعدہ کیا کہ وہ مناسب وقت پر یثرب کی طرف ہجرت کریں گے۔

۳۔ پیغمبر اکرم ﷺ کے لئے خطرہ

رسول اکرم ﷺ اور مدینہ کے لوگوں کے درمیان دوسرا پیمان عقبہ مشرکین مکہ کے خوف و وحشت کا باعث بنا اور سب مشرکین ''دارالندوہ''میں جمع ہوئے۔ مشرکین کے گروہ کے مقرر نے نشست کے آغاز میں اوس و خزرج کے قبائل کے ساتھ اسلامی طاقت کے عہد و پیمان کے متعلق بات کرتے ہوئے کہا: ہم "حرم" کے لوگ تمام قبائل کے درمیان قابل احترام تھے۔ لیکن محمد نے ہمارے درمیان اختلاف ایجاد کر دیا ہے۔ اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ راہ نجات یہی ہے کہ ہمارے درمیان سے ایک شجاع انسان کا انتخاب کیا جائے جو خاموشی کے ساتھ محمد کی زندگی کا خاتمہ کر دے اور اگر بنی ہاشم نے کسی ردعمل کا اظہار کیا تو ہم خون بہا دے دیں گے۔

شیطان جو ایک نجدی مرد کی صورت میں اس نشست میں موجود تھا اس نے کہا: یہ سازش قابل عمل نہیں ہے کیونکہ بنی ہاشم ہرگز محمد کے قتل پر خاموش نہیں بیٹھیں گے اور نہ ہی کسی خون بہا پر راضی ہوں گے لہذا جو بھی شخص اس سازش کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہے وہ اپنی زندگی کو داو پر لگا دے اور تمہارے درمیان کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے۔

ان کے سرداروں میں سے ابوالبختری نے کہا: بہتر رہے گا کہ محمد کو قید کر لیں اور انہیں بہت کم مقدار میں کھانا پانی دیں، اس طرح ہم ان کے دین کو پھیلنے سے روک سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر اس نجدی شخص (شیطان) نے کہا: یہ بھی پہلے والے منصوبے کی طرح ہے۔ کیونکہ اس طرح بھی بنی ہاشم تمہارے ساتھ جنگ کر کے محمد کو آزاد کروالیں گے اور اگر وہ اکیلے کامیاب نہ ہوئے تو حج کے موسم میں دوسرے سے قبائل سے مدد طلب کر کے کامیابی حاصل کر لیں گے۔

پھر ایک تیسرے شخص نے اظہار نظر کرتے ہوئے کہا: بہتر رہے گا کہ ہم محمد کو ایک بے مہار اونٹ پر سوار کر دیں ان کے ہاتھ پاوں باند دیں گے اس طرح وہ اونٹ انہیں بیابانوں اور صحراوں میں گھماتا لے جائے گا اور اگر وہ زندہ بچ بھی گئے تو کسی دوسرے قبیلے کے ہاتھ لگ جائیں گے اور وہاں اگر اپنے دین کی تبلیغ کرنے کی کوشش کریں گے تو اس قبیلے کے لوگ خود ان کا حساب کریں گے۔

ایک مرتبہ پھر اس نجدی شخص نے اس منصوبے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا: محمد کی زبان کا جادو اور ان کی شیرین کلامی تم پر واضح ہے۔ وہ اپنے بیان کی لطافت اور سخن کی بلاغت سے دوسرے قبیلوں کو اپنے ساتھ ملا کر تم پر حملہ آور ہو جائے گا۔ سب لوگوں پر سکوت طاری ہو گیا۔ ناگہاں ابوجہل نے کہا: بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہر قبیلے میں سے ایک ایک شخص نکلے اور سب مل کر رات کی تاریکی میں محمد کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں، اس طرح خون بہا تمام قبائل کے درمیان تقسیم ہو جائے گا۔ یقیناً اس صورت میں بنی ہاشم کے پاس تمام قبائل سے لڑنے کی طاقت نہیں ہوگی۔ اس منصوبے کو سب نے تسلیم کر لیا اور کچھ افراد کو اس کام کے لئے انتخاب کیا گیا اور یہ طے پایا کہ یہ لوگ رات کی تاریکی میں اس منصوبے کو سرانجام دیں گے۔

یہاں خدا کی طرف سے پیغمبر اکرم ﷺ کو دشمنوں کے اس مذموم منصوبے سے خبردار کیا گیا: **"وَ إِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ وَ يَمْكُرُونَ وَ يَمْكُرُ اللهُ وَ اللهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ"**[1] یاد کرو اس وقت کو کہ جب کفار

[1] سورہ انفال ۳۰

تمہیں زندان میں ڈالنے، قتل کرنے یا مکہ سے نکال دینے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ وہ منصوبہ سازی کر رہے تھے اور خدا بھی تدبیر کرتا ہے اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

۴۔ حامیوں کا فقدان

مکہ مکرمہ میں تمام تر دباو اور فشار کے دوران جو چیز پیغمبر اکرم ﷺ کے قلب کی تسکین کا باعث تھی وہ امیر المومنینؑ کے علاوہ دو اور حامیوں اور جاں نثاروں کا وجود تھا جو مسلسل آپ ﷺ کی تسلی قلب کا باعث تھا۔ وہ دو حامی اور تھے ایک آپ کے چچا جناب ابو طالبؑ اور دوسرے آپ کی بیوی حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا تھی؛ لیکن ایک ہی سال میں ان دونوں کی وفات ہوگئی جو آپ ﷺ کے لئے بہت سخت تھی آپ نے اس سال "عام الحزن" کے نام سے یاد فرمایا ان دو حامیوں کی وفات کے بعد قریش کا دباو آپ ﷺ پر بڑھ گیا تھا جس کے بعد خدا کے حکم سے مدینہ کی طرف ہجرت کا فیصلہ کیا۔

امام علیؑ کی فداکاری

لیکن دشمن کے منصوبے کو ناکام بنانے اور ان کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے پیغمبر اکرم ﷺ کو کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ان کے بستر پر سو جائے تاکہ دشمن صرف آپ ﷺ کے گھر کے محاصرے پر توجہ رکھیں اور مکہ سے باہر جانے والے راستوں کو خالی چھوڑ دیں لہذا آپ ﷺ نے امیر المومنین حضرت علیؑ سے اس سلسلے میں مشورہ کیا انھوںؑ نے بنا کسی تاخیر کے اسے قبول کر لیا۔ یہ وہی رات ہے جسے تاریخ میں "لیلۃ المبیت" کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یہ واقعہ اس قدر با اہمیت ہے کہ خود حضرت علیؑ اور دیگر ائمہ اطہارؑ نے متعدد مقامات امیر المومنینؑ کی افضلیت کو ثابت کرنے کے لئے اس سے استدلال کیا ہے۔ یہ آیہ شریفہ حضرت علی علیہ السلام کی فداکاری پر ہی نازل ہوئی:

"وَمِنَ النّاسِ مَن يَشري نَفسَهُ ابتِغاءَ مَرضاتِ اللهِ وَ اللهُ رَووفُ بِالعِبادِ"[1] بعض لوگ اپنے نفس کو خدا کی مرضی حاصل کرنے کی خاطر بیچ دیتے ہیں اور خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے۔

ابن اثیر (م ۶۳۰ق) لکھتے ہیں: جب پیغمبر اکرم ﷺ نے ہجرت کا فیصلہ کیا تو علی ابن ابی طالبؑ کو اپنے ساتھ نہیں لیا۔ اور انہیں چند قرضوں اور امانتوں کی ادائگی کی ذمہ داری سونپی اور حکم دیا کہ جس رات دشمن ان کے گھر کا محاصرہ کریں تو رسول کے بستر پر سو جائیں اور فرمایا: میری سبز خضرمی چادر کو زیب تن کر لینا انشاءاللہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ امیر المومنینؑ نے ایسا ہی کیا۔

ابن اثیر نقل نے نقل کیا ہے: "لیلۃ المبیت" (شب ہجرت) کا ماجرا جبرئیل اور میکائیل جیسے خدا کے مقرب فرشتوں کے نزدیک علیؑ کے مقام و منزلت میں اضافے کا باعث بنا۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی اپنی جان دوسرے پر قربان کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

یہ آپ ﷺ کی ہجرت کے چند عوامل تھے جو ہم نے بیان کئے

---

[1] سورہ بقرہ ۲۰۷

مدح محبوب دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ڈاکٹر پیام آعظمی

اے صل علی زیر قدم چرخ بریں ہے
لیکن تیری معراج کی حد وہ بھی نہیں ہے

اڑتی ہے تری گرد سفر بن کے مہ و مہر　　واقف تیری عظمت سے فلک ہے نہ زمیں ہے

ہر موج نفس ہے پئے امت دم عیسی
ہر نقش قدم کعبہ ارباب یقیں ہے

دشمن ہیں تیرے کیسے کشاکش میں گرفتار　　منکر ہیں رسالت کے صداقت کا یقیں ہے

اخلاق کی ضربوں سے فنا لشکر کیں ہے
فاتح ہے مگر ہاتھ میں تلوار نہیں ہے

اس سیرت اقدس کی مثال اور کہیں ہے؟　　کونین کا آقا ہے مگر خاک نشیں ہے

آیات کو مفہوم تیرے گھر سے ملا ہے
قرآں تیری عترت سے الگ کچھ بھی نہیں ہے

جھولا ترے بچوں کا جھلاتے ہیں فرشتے　　درباں ترے دربار میں جبریل امیں ہے

اسلام ہے زندہ تیرے بیٹوں کے لہو سے
شاہد تیرے ایثار پہ مقتل کی زمیں ہے

باقی ترا پیغام عمل نوک سناں پر　　زندہ تیری آواز تہ تیغ لعیں ہے

تخئیل کے پر جلتے ہیں اس راہ گزر میں
مداحی ممدوح خدا کھیل نہیں ہے

جن لوگوں نے چھوڑا ہے پیام آل کا دامن　　ان لوگوں کی قسمت میں نہ دنیا ہے نہ دیں ہے

***

اسلامی اتحاد کے تحقق میں کارفرما کچھ بنیادی اسباب

سجاد ربانی

اسلام ایسا دین ہے جس نے ابتداء ہی سے اپنے ماننے والوں کے درمیان اتحاد، ہمبستگی، اخوت و برادری کی فضا کو ہموار کرنے کی حد درجہ کوشش کی ہے تاکہ سرکار رسالتماب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جو الہی نظام و تمدن لے کر تشریف لائے تھے اس کے سائے میں بشریت اپنے کمال وارتقا کے سفر کو جاری رکھ سکے۔ چنانچہ خود بنفس نفیس پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے صدر اسلام میں ہی خود اس پر عمل کیا اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا نیز مسلمانوں کی طاقت و ہیبت کی بحالی اور قدرت و عظمت کے فروغ کے لئے انھیں تفرقہ و اختلاف سے پرہیز کرنے کا حکم دیا اور اسی وجہ سے دو مسلمانوں کے درمیان اختلاف و رنجش کو مٹاکر صلح کروانے کو واجب قرار دیا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی محنت و زحمات کے بعد امت میں اتنا عرصہ گذرنے کے بعد اختلاف و تفرقہ کی جڑوں کو بالکل خشک ہو جانا چاہئے تھا لیکن افسوس کہ ہم جیسے جیسے عصر رسالت سے دور ہوتے جارہے ہیں ویسے ویسے ہمارے حالات میں ترقی کے بجائے تنزلی کے آثار بڑی شدت سے ظاہر ہو رہے ہیں لہذا اسلامی اخوت و برادری کے لئے سعی و کوشش کرنے والے دلسوز افراد کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن و سنت اور سیرت اہل بیت علیہم السلام کی روشنی میں ان اسباب پر غور کریں جن کے سبب ہمارا معاشرہ صحیح اتحاد، برادری اور اخوت کی روح سے بہرہ مند ہو سکے چنانچہ اس ضمن میں چند ایک بنیادی و اساسی اسباب کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جارہا ہے:

پہلا سبب: توحید

تمام ادیان آسمانی کے ماننے والوں کے درمیان وحدانیت خداوند متعال وہ محوری نقطہ فکر ہے جس کے ذریعہ امت مسلمہ کے شیرازے کو بکھرنے سے روکا جاسکتا ہے۔ چونکہ قرآن مجید کی ہدایت کی روشنی میں نہ تنہا مسلمانوں کو بلکہ دیگر توحیدی ادیان کے پیرو کو بھی اس پرچم اور کلمہ توحید کے زیر سایہ جمع کیا جاسکتا ہے لہذا ضرورت ہے مسئلہ توحید اور وحدانیت خدا کو بڑی وضاحت کے ساتھ امت کے سامنے پیش کیا جائے اور اگر وہ کلمہ توحید اور اس کے تقاضوں کو سمجھ جائے تو پھر محال ہے کہ اس کے سامنے آپسی اختلاف کی کوئی معقول وجہ ہو۔

چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾[1]۔

ترجمہ: اے رسول کہہ دیجئے! اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک اور یکساں ہے (اور وہ یہ کہ) ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں، اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا اپنا رب (مالک و مختار) نہ

---

[1] سورہ آل عمران: ۶۴

بنائے۔ اور اگر یہ لوگ اس (دعوت) سے منہ موڑیں تو (اے مسلمانو) تم کہہ دو کہ گواہ رہنا ہم مسلمان (خدا کے فرمانبردار و اطاعت گزار ہیں)۔

ظاہر سی بات ہے کہ جب عقیدہ توحید و الوہیت پر دیگر آسمانی ادیان کے ماننے والوں کو متحد کیا جاسکتا ہے تو پھر مسلمانوں کو تو اس مسئلہ میں بطریق اولی متحد ہو ہی جانا چاہئے بلکہ ممکن ہے روز قیامت خداوند متعال اتحاد نہ کرنے والے مسلمانوں کو سزا بھی دے سکتا ہے کہ تم لوگ توحید، نبوت اور معاد میں متحد ہونے کے باوجود دشمنان اسلام کے مقابل متحد کیوں نہ ہوئے

دوسرا سبب: سنت وسیرت پیغمبر ﷺ کا اتباع

مسلمانوں کے درمیان اتحاد و برادری کے تحقق میں عقیدہ و مسئلہ توحید کے بعد سنت و سیرت رسول ﷺ کا اتباع و پیروی سب سے اہم سبب کے طور پر ملحوظ ہونا چاہئے ۔

اگر واقعاً مسلمان اپنے نبی کے فرامین اور آپ کی سیرت طیبہ پر غور کرتے ہوئے عمل پیرا ہو جائے تو کبھی بھی مسلمانوں کے درمیان تفرقہ، رنجش، کینہ و حسد کی دیواریں کھڑی نہ ہوں۔

آج مسلمان معاشرہ کی سب سے بڑی بد نصیبی یہ ہے کہ اسے یہ یاد ہے کہ فلاں فقیہ کا دیگر فقیہ سے اختلاف کس چیز پر ہے، فلاں عالم دوسرے عالم سے کیوں اختلاف رکھتا ہے لیکن اسے یہ یاد نہیں کہ سرکار نے مدینہ تشریف لانے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ یثرب کے دو مشہور قبائل اوس و خزرج کے درمیان صدیوں سے چلی آرہی آپسی رنجش و اختلاف کو جڑ سے ختم کروادیا اور صرف یہی نہیں کہ انصار کا نزاع ختم کروایا[1] بلکہ مہاجرین و انصار کے درمیان عقد اخوت بھی قائم فرما کر انہیں ایک دوسرے کی ہمدردی، محبت، رحمت و رأفت پر ابھارا[2]۔ اور آپ نے یہاں تک فرمایا کہ اگر کوئی شخص اس عالم میں رات بسر کرے کہ اسے اپنے ایمانی بھائی کی خبر نہ ہو وہ مسلمان نہیں ہے[3]۔

واقعاً آج بھی ہمیں سیرت و سنت رسول ﷺ پر چلنے اور عمل پیرا ہونے کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی اس دور کے مسلمانوں کو تھی۔ سارے حقائق ہماری نظروں کے سامنے ہیں لیکن پھر بھی ان سے نہ جانے کیوں غافل ہیں؟

تیسرا سبب: حبل اللہ سے تمسک

قرآنی تعلیمات کی رو سے اسلامی اتحاد و برادری کا ایک اہم سبب مسلمانوں کا حبل اللہ سے تمسک اور وابستگی اختیار کرنا ہے امت کے درمیان جیسے جیسے حبل اللہ سے تمسک کا شوق اور شعور بیدار ہوگا ویسے ویسے آپسی اختلاف ختم ہوتے چلے جائیں گے۔ چونکہ خود قرآن مجید نے اسے تفرقہ سے نجات اور اتحاد کے ایک ذریعہ اور سبب کے طور پر پیش کیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ

---

[1] ۔ مہران، محمد بیومی، تاریخ العرب القدیم، ص۴۸۱۔

[2] ۔ زرگری نژاد، غلامحسین، تاریخ صدر اسلام، ص۳۴۹۔

[3] ۔ حر عاملی، محمد بن حسن، وسائل الشیعۃ، ج۱۶، ص۳۳۷۔

جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾[1]۔

ترجمہ: اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو اور اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا ہے کہ تم آپس میں دشمن تھے اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت (فضل و کرم) سے بھائی بھائی ہو گئے۔ اور تم آگ کے بھرے ہوئے گڑھے (دوزخ) کے کنارے پر کھڑے تھے جو اس نے تمہیں اس سے بچالیا اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنی نشانیاں ظاہر کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاجاؤ۔

اب جبکہ قرآن مجید نے حبل اللہ کو اتحاد کی علامت اور ہمبستگی کی نشانی قرار دیا ہے تو ہر مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ یہ پہچاننے کی کوشش کرے کہ حبل اللہ کیا ہے؟

چنانچہ آیت کے ظاہر سے حبل اللہ کی سب سے واضح خصوصیت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو گمراہی سے نجات دیتی ہے اور راہ راست کی طرف ہدایت کرتی ہے اور جو اس سے تمسک کرے گا وہ کبھی گمراہ نہ ہوگا۔

آیت میں موجود حبل اللہ کے معنی کو سمجھنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے تواتر کے ساتھ نقل ہونے والی روایت، حدیث ثقلین کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے جیسا کہ خود متن حدیث: **إنّي تارك فيكم الثقلين كتاب الله و عترتي أهل بيتي ما إن تمسّكتم بهما لن تضلّوا أبداً**؛[2] سے سمجھ میں آتا ہے کہ جو خصوصیات اللہ نے مذکورہ آیت میں ارشاد فرمائی ہیں وہ ساری کی ساری ثقلین مبارکین میں پائی جاتی ہیں۔ لہذا قرآن کریم اور اہل بیت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی وہ حبل اللہ ہیں کہ جن کے فرامین پر عمل مسلمانوں کو حقیقی اتحاد و برادری تک پہونچائے گا۔[3]

اور لطف کی بات یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے قرآن کریم اور عترت طاہرہ دونوں کو ایک ساتھ باعث ہدایت قرار دیا ہے کیونکہ وہ قیامت تک ایک دوسرے جدا نہ ہونگے اس بنا پر ان میں سے صرف ایک سے تمسک کامل تمسک نہیں ہوگا اور نہ باعث ہدایت قرار پائے گا کیونکہ یہ عمل بعض آیات کو چھوڑ کر بعض دیگر آیات پر ایمان رکھنے کے مترادف ہوگا جو خداوند متعال کی نظر میں مردود اور غیر قابل قبول ہے۔

چوتھا سبب: مشترکات پر تاکید

کسی بھی معاشرہ میں اتحاد و برادری کی جڑوں کو مضبوط کرنے کا ایک بنیادی سبب مشترکات پر تاکید ہے۔ چنانچہ امت اسلامی کے تمام فرقوں کے نزدیک کچھ بنیادی مشترکات ہیں کہ جن کی پابندی کو ہر فرقہ و مذہب اسلام کی اصل اور شریعت کی روح جانتا ہے چنانچہ مقصد واحد کی طرف گامزن ہونے کے لئے ضروری ہے مسلمان اس امر پر توجہ دیں۔ چنانچہ دین میں مشترکات کی تعداد کم نہیں ہے بلکہ اگر مبالغہ نہ ہو تو

---

[1] سورہ آل عمران: ۱۰۳

[2] ۔ دیلمی، حسن بن محمد، ارشاد القلوب، ج ۱، ص ۱۳۱۔

[3] ۔ رجوع کیجئے: معصومہ بخشی، عوامل وحدت و انسجام در قرآن و حدیث، ص ۷۔

۹۵ فیصد مسائل امت کے درمیان مشترکات کی حیثیت رکھتے ہیں اور صرف ۵ فیصد ہی وہ مسائل ہیں جہاں اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ اصول سے لے کر فروع تک، عقائد سے لیکر اعمال تک امت کے درمیان اکثر مسائل مشترکات کی فہرست میں آتے ہیں چنانچہ اللہ تعالی کی وحدانیت، رسول اللہ کی رسالت، معاد و قیامت پر عقیدہ، نماز، روزہ، حج، زکات، خمس جہاد وغیرہ وہ مسائل ہیں جنہیں امت کے مشترکات قرار دیا جاسکتا ہے۔ البتہ یہ ذہن نشین رہے کہ ان سب مسائل میں کیفیت کا اختلاف بہر حال موجود ہے لیکن کیفیت کے اختلاف کو انکار کے مترادف قرار دینا یقیناً ناانصافی ہوگی۔

پانچواں سبب: دشمن شناسی

حقیر کی نظر میں مذکورہ تمام اسباب کے درمیان سب سے اہم سبب کہ جس کے طفیل مسلمانوں کے درمیان اتحاد و برادری کی فضا ہموار ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے حقیقی دشمن کو پہچان کر یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ مسلمانوں کے درمیان اتحاد ہونے کی صورت میں سب سے زیادہ نقصان کس گروہ کا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو اپنے دشمن کے عزائم سے واقف ہو کر یہ اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ آج اسلام کا دشمن کیا کھیل کھیل رہا ہے۔ چونکہ جب تک امت میں اپنے دشمن کی سازشوں سے نقاب کشائی کا شعور بیدار نہ ہوگا تب تک حقیقی اتحاد وجود میں نہیں آسکتا۔ آج اسلام دشمن طاقتیں اس امر پر کمربستہ ہیں کہ کسی صورت اسلام کے نورانی و مقدس چہرے کو مسخ کر دیا جائے قرآن مجید کو دنیا سے مٹا دیا جائے تاکہ اللہ کا دین ختم ہو جائے چنانچہ وہ اس امر کے لئے طرح طرح کی پروگرامنگ کرتے ہیں، طرح طرح کی سرمایہ گذاری کرتے ہیں لہذا مسلمانوں کا فرض بنتا ہے کہ اپنے آپسی جزئی اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اصل اسلام و قرآن کا دفاع کریں چونکہ جب اسلام سرافراز رہے گا تو مسلمان باعزت زندہ رہ سکیں گے اور اگر اسلام ہی نہ رہا تو پھر مسلمانوں کا وجود خود بخود ختم ہو جائے گا چونکہ اسلام ہی ہماری جان ہے، اسلام ہی ہماری پہچان ہے چنانچہ ضروری ہے کہ تمام مسلمان مل کر حقیقی اسلام کو پیش کرنے کی کوشش کریں اور دشمن کو یہ باور کرائیں کہ ہم سارے مسلمان متحد ہیں اور ہمارے درمیان کوئی ایسا اختلاف نہیں ہے جس کی بنیاد پر تم ہم پر حکمرانی کر سکو، بلکہ ہمارا مالک و مختار خدائے قہار ہے۔

قارئین کرام! ہم نے اس مقالہ میں اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلامی اتحاد کے تحقق میں کارفرما صرف چند ایک بنیادی اسباب کا تذکرہ کرنے پر ہی اکتفاء کیا ہے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ اور فکری جمود سے مقابلہ

حجۃ الاسلام والمسلمین مھدی پیشوائی

فکری جمود اور روشن فکری

فکری جمود کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی مسئلہ سے باخبر ہونے کے بعد اس سے متعلق دلائل فراہم کرے اور کسی نتیجہ تک پہونچ کر اسے اپنا عقیدہ بنالے پھر اس مسئلہ سے متعلق کسی مزید گفتگو یا اس کے خلاف کوئی دلیل سننے کے لئے آمادہ نہ ہو، یعنی اسی عقیدہ پر اپنی فکر کو محدود کرلے۔ اسی طرح جب فکری جمود کی لفظ استعمال کی جاتی ہے تو اس سے کچھ قدامت پسندی کی بھی بو آتی ہے، یعنی فکری جمود کا حامل شخص قدامت پسند ہوتا ہے، قدیم افکار میں گم ہوتا ہے اور کوئی نئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ فکری جمود کے مقابلے میں روشن فکری کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ روشن فکر اسے کہتے ہیں جو کھلی اور روشن فکر کا مالک ہو یعنی پڑھا لکھا ہو، اچھا مطالعہ رکھتا ہو اور نئی بات مان لیتا ہو۔

ہمارا موضوع ہے کہ حضرت امام صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فکری جمود سے کیسے مقابلہ کیا لیکن میرے خیال میں امام صادق علیہ السلام کا دور فکری پرورش کا دور تھا، البتہ چند ایک گروہ جامد فکر بھی رکھتے تھے جن سے آپ نے مقابلہ کیا ہے لیکن عام طور سے آپ کا دور ایک فکری نقل وانتقال اور تبادلہ آراء کا دور تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ سیاسی نظام میں تبدیلی آچکی تھی۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ ہمارے ائمہ میں صرف امام صادق (ع) ہی وہ تنہا امام ہیں جنہوں نے بنی امیہ اور بنی عباس دونوں کا دور حکومت دیکھا ہے اور دونوں ادوار میں موجود رہے ہیں۔

۱۱۴ھ میں امام محمد باقر علیہ السلام کی شہادت ہوئی جس کے بعد امام صادق علیہ السلام منصب امامت پر فائز ہوئے۔ ۱۳۲ھ میں بنی عباس بنی امیہ کا قلع قمع کر کے خود تخت حکومت پر قابض ہو گئے۔ تاریخ میں ہم نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ جس وقت کوئی نئی حکومت آتی ہے اور طویل مدت تک حکومت کرنا چاہتی ہے تو وہ اپنے طرز فکر سے ہم آہنگ کلچر اور ماحول پیدا کرتی ہے پھر جب تک وہ حکومت رہتی ہے اس کا ایجاد کردہ طرز فکر اور ماحول بھی باقی رہتا ہے اور جب وہ حکومت ختم ہو جاتی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ اس کا بنایا ہوا ماحول اور طرز فکر بھی جاتا رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے نئے سیاسی نظام کے ساتھ ساتھ نیا طرز فکر بھی لوگوں میں آجاتا ہے۔ اس کی زندہ مثال عراق ہے جہاں تیس چالیس سال تک بعث پارٹی برسر اقتدار رہی ہے۔ اس نے اپنا پسندیدہ کلچر اور طرز فکر رائج کر رکھا تھا۔ بہت سارے جوانوں کی تربیت اپنے ماحول کے مطابق کی تھی۔ صدام نے جمہوری اسلامی پر جو جنگ تھوپی تھی اس کے شروع کے چند سالوں میں اسے اس لئے برتری مل رہی تھی کہ اس نے آرمی ٹرینیڈ کر رکھی تھی اور ان میں اس نے بعث پارٹی کا کلچر کوٹ کوٹ کر بھر رکھا تھا۔ وہ صدام ہی کی طرح سوچتے تھے لیکن اب عراق میں بعثی نظام ختم ہوا ہے تو تہذیبی لحاظ سے بھی ایک نیا ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ اب کُردوں کو بھی بولنے کا موقع مل گیا ہے، سنی بھی اپنی بات کہہ رہے ہیں اور شیعہ بھی خاموش نہیں ہیں، ہر گروپ اپنی بات کہہ رہا ہے۔ یہ ایک تجربہ کی بات ہے ایران میں بھی انقلاب کی کامیابی کے بعد ایک نئی فضا اور نیا ماحول بن گیا تھا۔

عصر امام صادق علیہ السلام

امام صادق علیہ السلام کے زمانے میں جب بنی امیہ کی حکومت ختم ہو گئی تو ان کا ایجاد کیا ہوا طرز فکر اور ان کی بنائی ہوئی تہذیب بھی ختم ہو گئی۔ جب بنی عباس نے اقتدار سنبھالا تو ان کے افکار اور بنی امیہ کے افکار میں کافی فرق تھا۔ یہ اپنی جدید فکر پیش کرتے تھے پھر اسی دور میں جیسا کہ ہم نے کتاب ''سیرہ پیشوایان'' میں بھی تذکرہ کیا ہے، تھوڑا بہت یونانی کتب کے ترجمہ کا باب کھل گیا تھا۔ مسلمانوں نے یونانی فلاسفہ کے اقوال و کتب کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا، مختلف مذہبی فرقے پیدا ہوئے، آزادی ٔفکر کا ماحول بنا، بحث و مناظرے ہونے لگے۔ اس طرح مختلف گروہ اور مختلف فرقے وجود میں آگئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب بنی عباس کی دین تھی لیکن شہید مطہری فرماتے ہیں کہ آزادی فکر تبادلہ خیال، گفتگو، بحث اور استدلال، یہ سب اسلام کی برکات تھیں، نہ یہ کہ بنی عباس کی دین تھی۔ ہاں! بنی عباس نے اتنا کیا کہ ان سب پر پابندی نہیں لگائی۔ بنی امیہ نے تو لوگوں کا دم گھونٹ رکھا تھا۔ وہ صرف اپنی فکر رائج کرنا چاہتے تھے لیکن بنی عباس نے ایسا نہیں کیا جس کی وجہ سے اسلام میں موجود آزادی ٔفکر، بحث و گفتگو اور استدلال کو راستہ ملا تو اس نے رشد کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح آپ کے زمانے میں ایک عجیب ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ امام صادق علیہ السلام کا دور وسعت فکری کے ساتھ ساتھ فکری تناؤ کا بھی دور تھا یا شہید مطہری کے بقول آپ کے دور میں ادیان و مکاتب اور افکار و نظریات کا بازار گرم تھا۔ جو شخص چاہتا تھا بولتا تھا لھٰذا اسلام واقعی یعنی مکتب تشیع کے وارث امام صادق علیہ السلام کو حقیقی اسلام کی حمایت اور ترویج میں صرف ایک دو محاذ پر مقابلہ نہیں تھا بلکہ آپ کو کئی ایک فکری محاذ سر کرنے پڑ رہے تھے۔

امام صادق علیہ السلام کا دہریوں سے مقابلہ

ان میں فکری جمود رکھنے والے کچھ زندیق اور دہریئے تھے جن کا وہی کہنا تھا جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کے دہریئے کہتے تھے ''اِنْ ھی اِلاّ حیاتنا الدنیا نموت و نحیی وما یھلکنا الا الدھر'' آج کے دور کے مادّہ پرستوں کی طرح وہ کہتے تھے کہ محسوسات کے علاوہ ہم کسی چیز کے وجود کے قائل نہیں ہو سکتے۔ معقولات کوئی چیز نہیں ہے۔ جس چیز کو ہم چھوتے ہیں، دیکھتے ہیں، سنتے ہیں یا چکھتے ہیں اسی کو مانتے ہیں۔ تو یہ اس دور کے میٹریالسٹ یا مادّہ پرست تھے جن کو زندیق یا دہریہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ امام صادق علیہ السلام کو جن فکری گروہوں سے مقابلہ کرنا تھا ان میں بہت زیادہ فکری جمود رکھنے والا گروہ بھی تھا۔

امام صادق علیہ السلام اور مکتب ابو حنیفہ

آپ کے سامنے ایک دوسرا محاذ فقہ میں قیاس کے ماننے والوں کا تھا۔ اس گروہ کے سرغنہ ابو حنیفہ تھے۔ ابو حنیفہ ذاتی رای اور قیاس کی بنیاد پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔ علماء اہل سنت بھی مانتے ہیں کہ ایک قول کے مطابق ابو حنیفہ کو صرف ستّرہ حدیثیں یاد تھیں۔ کچھ اس سے بھی زیادہ بڑھ کے بولے ہیں۔ مقدمہ ابن خلدون میں ابن خلدون کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ احادیث سے کم کام لیتے تھے اور وہ اس لئے کہ شاید ان کی نظر میں بیشتر احادیث غیر معتبر تھیں۔ بہر حال اتنا طے ہے کہ ابو حنیفہ کو بہت تھوڑی سی حدیثیں یاد تھیں، یہ اور بات ہے کہ ابن خلدون نے خوش فہمی سے کام لیتے ہوئے اسے ایک دوسرا رخ دے دیا ہے کہ ابو حنیفہ کے نزدیک احادیث معتبر بہت کم تھیں۔ چونکہ ماضی میں جنگ و

جدال اور صنع حدیث کا دور تھا اس لئے ابو حنیفہ ان احادیث کو معتبر نہیں سمجھتے تھے اور احکام شریعت میں اپنی ذاتی رائی اور قیاس سے کام لیتے تھے۔ اس طرح امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے ایک محاذ ان لوگوں کا تھا جو احکام میں قیاس کے قائل تھے۔

امام صادق علیہ السلام اور فرقہ مشبہ

ایک دوسرا فکری محاذ ان لوگوں کا تھا جنہیں مشبہ کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ خدا کو انسان سے تشبیہ دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ خدا کے اعضاء ہیں، جسم اور آنکھیں ہیں۔ قرآن میں موجود اس طرح کی آیات کو ان کے ظاہر پر حمل کرتے تھے مثلاً "**واللہ یسمع تحاورکما**" اے پیغمبر تمہارے پاس جو عورت اپنے شوہر کی شکایت لے کر آئی تھی خدا تم لوگوں کی باتوں کو سن رہا تھا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا سن رہا تھا یعنی اس کے کان ہیں، یا مثلاً "**الرحمن علی العرش استوی**" کہتے ہیں یعنی رحمٰن عرش پر اپنا مکان رکھتا ہے۔ ابن تیمیہ منبر پر بیٹھ کر کہا: "**الرحمن علی العرش استوی**" کا مطلب یہ ہے کہ جیسے میں اس وقت منبر پر بیٹھا ہوں ایسے ہی خدا عرش پر بیٹھتا ہے۔ یہ سب باتیں ان کی کتابوں میں بھی موجود ہیں اور اب بھی وہ یہ باتیں زور دے کر کہتے ہیں، یا مثلاً قیامت کے بارے میں خدا فرماتا ہے "**وجاء ربك والملك صفاً صفا**" اے پیغمبر! روز قیامت تمہارا رب اور ملائکہ صف در صف آئیں گے، ہم شیعہ اور معتزلہ کہتے ہیں کہ یہاں پر "امر" پوشیدہ ہے یعنی امر خدا اور ملائکہ، جبکہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں یہ امر وغیرہ تم نے اپنی طرف سے گڑھ لیا ہے، خدا کہتا ہے "**وجاء ربّك**" یعنی خود خدا آئے گا۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں خدا دیکھا نہیں جاسکتا لیکن آخرت میں جب وہ خود آئے گا تو سب اس کا دیدار کریں گے۔ اس طرح کے لوگ امام صادق علیہ السلام کے زمانہ میں تھے۔

امام صادق علیہ السلام اور مرجئہ

ایک اور خطرناک گروہ تھا جس کا نام "مرجئہ" تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ بنی امیہ ان لوگوں کی پشت پناہی کرتے تھے اور اگر بنی امیہ ان کی پشت پناہی نہ بھی کرتے رہے ہوں تب بھی ان کے اور بنی امیہ کے رجحانات ایک جیسے تھے۔ ان کے نظریات بنی امیہ کے لئے بڑے فائدہ مند ثابت ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایمان ایک امر قلبی ہے۔ دل میں ایمان ہو بس کافی ہے یعنی کسی شخص کے دل میں ایمان ہو عمل میں چاہے بت پرستی کرے، شراب پیئے یا کچھ بھی کرے اس کے ایمان کو کوئی نقصان پہنچنے والا نہیں ہے۔ یہ نظریہ بنی امیہ کے لئے بڑا مفید ثابت ہوا۔ وہ اس نظریہ کی بہت ترویج کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ہم نے کوئی غلط کام کیا ہے یا گناہ کیا ہے تو اس سے ہمیں یا ہمارے ایمان کو کوئی ضرر پہنچنے والا نہیں ہے۔ اس طرح امام علیہ السلام کے سامنے فکری محاذ پر ایک دو گروہ نہیں تھے بلکہ کئی ایک گروہوں سے آپ برسرپیکار تھے۔

روش مبارزہ

اب جائزہ لیتے ہیں کہ امام علیہ السلام ان تمام گروہوں سے کس طرح مقابلہ کرتے تھے۔ امام علیہ السلام در حقیقت دو طرح سے ان لوگوں کا مقابلہ کرتے تھے؛ ایک یہ کہ خود براہ راست ان کے مقابلے میں آتے تھے، دوسرے یہ کہ آپ شاگرد تربیت کرتے تھے اور آپ کے شاگرد جاکر بحث کیا کرتے تھے لیکن آپ کا مقابلہ منطقی اور استدلالی ہوا کرتا تھا۔ کبھی حضرت ایک فکری جھٹکا دے دیا کرتے تھے کہ سامنے والا

کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائے اور کم از کم احتمال تو دے کہ میری بات غلط بھی ہو سکتی ہے۔ فکری اعتبار سے منجمد شخص اپنی بات کے غلط ہونے کا احتمال تک نہیں دیتا لہٰذا حضرت ان کو فکری جھٹکا دیا کرتے تھے کہ کم از کم دل میں اپنی بات کے غلط ہونے کا احتمال پیدا ہو جائے اور پھر یہی احتمال ایک محرک بن کر انسان کو اپنے خیال پر نظر ثانی کرنے کے لئے مجبور کر دے۔

حضرت عام طور سے استدلالی انداز سے وارد میدان ہوتے تھے اور استدلال کبھی عقلی ہوتا تھا تو کبھی نقلی، کبھی جدل کی شکل میں تو کبھی منطقی۔ حضرت کبھی خود براہ راست ان کے بڑوں کے مقابلے میں جاتے تھے جن کا اصرار ہوتا تھا کہ خود حضرت سے بحث کریں اور کبھی ان شاگردوں کو میدان میں بھیجتے تھے جن کی آپ نے تربیت کر رکھی تھی یا تربیت کر رہے تھے۔ یہ مطلب بھی قابل ذکر ہے کہ ایک قول کے مطابق امام جعفر صادق علیہ السلام یونیورسٹی میں طلاب کی تعداد چار ہزار تھی۔

مرحوم شیخ مفیدؒ نے فرمایا ہے کہ یہ چار ہزار شاگرد مختلف موضوعات میں تربیت شدہ تھے۔ کلام اور مناظرات کلامی میں ہشام بن عبد الملک، ہشام بن سالم یا مومن طاق، فقہ میں محمد بن مسلم، زرارۃ ابن اعین اور زرارۃ کے بھائی حمران بن اعین، ادبیات میں ابان بن تغلب اور اس طرح دیسوں دوسرے افراد کہ جن کا تذکرہ ہم نے ''سیرہ پیشوایان'' میں بھی کیا ہے، مختلف علوم میں مہارت رکھتے تھے۔ حضرت نے مختلف موضوعات میں (Specialization) یعنی تخصصی سلسلہ قائم کیا تھا۔ فقہ، کلام، تفسیر، حدیث، علم قرائت اور ادبیات وغیرہ اور جس علم میں بھی کوئی شخص رجوع کرتا تھا تو آپ اسے اپنے شاگردوں کی طرف بھیج دیتے تھے۔ ایک جگہ ملتا ہے کہ ایک آنے والے کا اصرار تھا کہ خود حضرت سے بحث کرے گا۔ حضرت نے اس سے فرمایا: اگر تو نے میرے اس شاگرد کو شکست دے دی گویا مجھے شکست دے دی۔ آپ اس طرح کے ماہر شاگردوں کی تربیت کر رہے تھے۔

بعض نمونے

اب حضرت کے مخالفین سے مقابلہ کے کچھ نمونوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس زمانے میں ایک گروہ دہریوں اور زندیقیوں کا تھا جو کسی بھی صورت میں خدا کو نہیں مانتے تھے۔ زندیق کی لغت کے بارے میں بعض کا خیال ہے کہ یہ کلمہ فارسی سے ماخوذ ہے۔ حال ہی میں ناچیز کی ایک کتاب ''تاریخ اسلامی'' کے نام سے یونیورسٹی نے شائع کی ہے۔ اس کتاب میں ہم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے ادیان و مذاہب کے بارے میں بحث کی ہے اسی ضمن میں زندیق بھی زیر بحث آئے ہیں۔ اس کے حاشیہ میں بحث کی گئی ہے کہ یہ کلمہ زندیق کہاں سے آیا ہے۔

انہیں زندیقوں میں ایک شخص عبد الکریم بن ابی العوجاء تھا جس کی معلومات کافی زیادہ تھیں اور وہ بہت ہی شاطر دماغ کا مالک تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ حضرت کے شاگرد اس سے بحث کرنے میں اپنی بات ثابت نہ کر پاتے تو حضرت ہدایت کرتے تھے اور یہ جا کر اسے جواب دیتے تھے، پھر وہ کہتا تھا کہ یہ بات جو تم کہہ رہے ہو وہ تمہارے ذہن کی نہیں ہے۔ یہ حجاز سے آئی ہے، یعنی تم امام صادق علیہ السلام سے پوچھ کر آئے ہو۔ یہ تمہارے اپنے ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔

مومن طاق جو کوفہ (عراق) میں رہتے تھے، انہیں حضرت کی خدمت میں حاضری کا موقع کم ملتا تھا۔ ایک روز مدینہ (حجاز) میں حضرت کی خدمت میں پہونچے اور عرض کرنے لگے مولا! ابن ابی العوجاء سے بحث چل رہی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ کیا ایسا نہیں ہے کہ جو شخص کسی چیز کو بنائے وہ اس کا خالق ہوا کرتا ہے؟ میں نے کہا ہاں! ایسا ہی ہے تو اس نے کہا کہ دو مہینہ مجھے وقت دو میں تمہارے سامنے ایک ایسی مثال پیش کروں گا جس سے تمہیں اندازہ ہوگا کہ میں بھی خالق ہوں۔ تم کہتے ہو خدا ایک ہے اور وہی خالق ہے لیکن میں تمہیں بتاوں گا کہ نہیں ایک دوسرا خالق بھی ہے اور وہ ابن ابی العوجاء ہے۔ امام نے فرمایا اس نے جو تم سے دو مہینہ کی مہلت مانگی ہے اس میں وہ دو بھیڑ کی کھالوں میں گندگی بھر کے رکھ دے گا اور پھر دو مہینے میں اس گندگی سے کیڑے ہی کیڑے پیدا ہو جائیں گے پھر وہ ان کھالوں کو لے کر تمہارے پاس آئے گا اور کہے گا کہ ان کیڑوں کو میں نے خلق کیا ہے۔ قرآن نے جس بات پر زیادہ تاکید کی ہے کہ خدا خالق موت و حیات ہے خصوصاً حیات کے بارے میں زیادہ تاکید ہے، "**فاذا نفخت فیه من روحی**" روح میری جانب سے ہے اور ابن ابی العوجاء اس بات کو رد کرنا چاہتا ہے کہ خالق فقط ایک ہے۔ وہ کہے گا کہ دیکھو یہ کیڑے زندہ موجود ہیں اور انہیں میں نے خلق کیا ہے تم مسلمان کہتے ہو کہ خالق ایک ہے جبکہ میں بھی ان کیڑوں کا خالق ہوں۔ حضرت نے فرمایا جب یہ ان کھالوں کو لے کر تمہارے پاس آئے تو تم کہنا کہ ہم اگر کہتے ہیں کہ خدا خالق ہے تو ساتھ میں یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اپنی مخلوقات سے آگاہ ہے اور بنیادی طور پر ہر صانع اپنی مصنوع سے باخبر ہوتا ہے۔ خدا کو اپنی مخلوقات کی ہر بات کا علم ہے خواہ وہ چھوٹی سی بات ہو یا بڑی۔ اسے پتہ ہے کہ میری کون سی مخلوق نر ہے اور کون سی مادہ۔ اب تم اگر اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ ان کیڑوں کو تم نے خلق کیا ہے تو بتاو ان میں سے کتنے مذکر ہیں اور کتنے مونث۔

مومن طاق ایک دو ماہ بعد جب کوفہ لوٹے تو ابن ابی العوجاء کا وقت معینہ آگیا تھا اور جیسا کہ حضرت نے پیشینگوئی کی تھی ابی العوجاء گندگی سے بھری بھیڑ کی دو کھالیں لے کر آن پہونچا اور کہنے لگا مومن طاق! اب وقت آگیا ہے تمہیں تمہارے دعوے سے منحرف کرنے کا مومن طاق نے کہا: کہو کیا بات ہے؟! اس نے کہا دیکھو! اور اس نے بھیڑ کی کھال کھول دی جو کیڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ کہنے لگا دیکھو یہ زندہ موجودات ہیں اور انہیں میں نے خلق کیا ہے۔ تم جو یہ کہتے ہو خالق فقط خدا ہے، غلط ہے مومن طاق بھی کہ جو امام صادق علیہ السلام سے سیکھ کر آئے تھے، کہنے لگے: ہر خالق کو اپنی مخلوق کا علم ہوتا ہے تم یہ کہتے ہو کہ ان کیڑوں کو تم نے خلق کیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ بتاو کہ ان میں سے کتنے مذکر ہیں اور کتنے مونث؟ اس نے اس طرف سوچا تک نہ تھا کہنے لگا: یہ بات تو بڑی عجیب ہے لیکن یہ بات تمہاری نہیں ہے۔ اسے کوئی قافلہ مدینہ سے لے کر آیا ہے یعنی تم نے یہ بات جعفر بن محمد (علیہما السلام) سے سیکھی ہے۔ پس حضرت کا ایک طریقہ یہ تھا کہ آپ تشریح کرتے تھے شاگردوں کو طریقہ بتاتے تھے حتیٰ آپ کے وہ شاگرد جو دور رہتے تھے ان کو بھی آپ تعلیم دیتے اور تربیت کرتے تھے۔

ابن ابی العوجا جب کبھی اصحاب امام سے مناظرہ کرتا تھا تو جلدی ہار نہیں مانتا تھا نئی سے نئی بات بنالاتا تھا اور کبھی کبھی حد سے تجاوز کر جاتا تھا مثلاً خدا و پیغمبر کا انکار کرتا تھا تو امام کے اصحاب کا پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا تھا اور غصّہ میں آجاتے تھے پھر وہ کہتا تھا کہ تمہارے آقا جعفر ابن

محمد (علیہما السلام) تو اس طرح نہیں ہیں ؟میں ان کے سامنے اس سے بھی بری باتیں پیش کرتا ہوں مگر وہ کبھی غصّہ نہیں ہوتے۔ وہ بیٹھتے ہیں اور بحث کرتے ہیں۔

ایک بار امام صادق علیہ السلام مکہ میں خانہ کعبہ کے طواف میں مشغول تھے۔ ابن ابی العوجاء آیا اور امام کی طرف رخ کر کے کہنے لگا اس میں کون سی بات ہے کہ آپ بار بار اس کا چکر لگاتے ہیں، پھر کہتا ہے کہ یہ گھر پتھر ہی سے تو بنا ہے جس کے گرد آپ لوگ گھومتے ہیں۔ اِس پتھر میں اور اُس پتھر میں کیا فرق ہے جس کا بت بنا کر اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ وہ لوگ پتھر کے بتوں کو پوجتے ہیں اور آپ لوگ پتھر کے بنے اس گھر کو خانہ خدا مان کر اس کا طواف کرتے اور اس کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کا کیا فائدہ ہے ؟ حضرت نے دیکھا کہ یہاں استدلال پیش کرنے کا مناسب موقعہ نہیں ہے لہذا آپ نے فرمایا "اے ابن العوجاء! ہم جو کہتے ہیں کہ خدا ہے، بہشت ہے، قیامت ہے اور اگر یہ ہمارے عقیدے تمہاری فکر کے مطابق جھوٹے اور بے بنیاد ہوں تب بھی ہمیں کوئی نقصان نہیں ہوگا سوائے اس کے کہ ہم نے کچھ بے کار کام انجام دیئے ہوں گے لیکن دوسرے رخ سے بھی سوچو! اگر وہ سب درست ہو جو ہم کہتے ہیں بہشت ہو، جھنم ہو اور ایک خالق ہو اور تم ان سب چیزوں کا انکار کرتے ہو، اگر یہ باتیں سچ ہوئیں تو تم کیا کرو گے اور تمہیں کتنا گھاٹا اٹھانا پڑے گا؟ ابن ابی العوجاء یہ سن کر سُست پڑ گیا اور کہنے لگا صحیح بات ہے اگر یہ سب کچھ صحیح نکلا تو مجھے بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ حضرت نے اس کے ذہن کو جھٹکا دیا کہ کم سے کم اسے اپنی بات کے غلط ہونے کا احتمال ہو جائے۔

ایک روز انہیں زندیقیوں میں سے ایک شخص امام کی خدمت میں آیا۔ اس کا نام عبد الملک بن عبد اللہ تھا۔ وہ حضرت سے بحث کرنا چاہتا تھا۔ حضرت نے پہلے ہی اس سے اس کے نام کے بارے میں سوال کر دیا: "تم کون ہو اور تمہارا نام کیا ہے ؟ اس نے کہا: عبد الملک بن عبد اللہ۔ امام نے سوال کیا: پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یہ ملک کون ہے جس کے تم بندے ہو؟ یہ آسمان کا ملک ہے یا زمین کا ملک ہے ؟ چونکہ ملک اور بادشاہ سے مراد یہاں پر ذات خداوند تھی اسی لئے آپ نے پوچھا کہ پہلے مجھے بتاؤ کہ تم جس بادشاہ کے غلام ہو وہ کون سا بادشاہ ہے ؟ حضرت کبھی کبھی ان کے نام کو ہی مرکز بنا کر بحث شروع کر دیتے تھے اس لئے کہ وہ اپنے نام کو تو کم سے کم مانتے ہی تھے۔ پھر آپ نے فرمایا: تمہارے باپ کا نام عبد اللہ ہے۔ یہ کس خدا کا بندہ ہے اور وہ خدا کہاں کا خدا ہے ؟ آسمان کا خدا ہے یا زمین کا؟ وہ کون سا خدا ہے جس کا یہ بندہ ہے ؟ پہلے مجھے ان سب کا جواب دو پھر مجھ سے بحث کرنا؟ وہ شخص مات و مبہوت رہ گیا اور بحث اپنے اگلے مرحلے میں داخل نہ ہو سکی۔ امامؑ نے ایسا اس لئے کیا کیونکہ وہ سمجھنے کے لئے نہیں بلکہ فقط بحث و جدال کرنے کے لئے آیا تھا۔

حضرت موقع محل دیکھ کر اس طرح سے بھی مخالفین کا مقابلہ کرتے تھے۔ چونکہ محاذ مختلف تھے، افراد مختلف تھے لہذا ان سے مقابلے کے لئے آپ مختلف طریقے اختیار کیا کرتے تھے۔ دوسرے فرقوں اور فکری محاذوں پر بھی آپ اسی طرز استدلال سے اپنی بات پیش کرتے یا دفاع کرتے تھے۔ میں آپ کے مناظروں میں سے نمونہ کے طور پر ابو حنیفہ سے ہونے والا ایک مناظرہ پیش کرتا ہوں۔ یہ احتجاج طبرسی میں ہے۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ احتجاج طبرسی ان مناظرات سے مخصوص ہے جو چہارہ معصومین علیہم السلام نے مختلف ابواب میں انجام دیئے ہیں۔ یہ ایک اچھی اور قیمتی کتاب ہے۔ اگر اس کا مطالعہ کرنا چاہیں تو تحقیق شدہ ایڈیشن کا مطالعہ کریں۔ میرے پاس نجف کا پرانہ ایڈیشن ہے

لیکن امام صادق علیہ السلام فاونڈیشن قم سے سات آٹھ سال قبل اس پر تحقیق کی گئی ہے اور محققین سے جہاں تک ہو سکا ان مناظرات کے مصادر ڈھونڈ نکالے ہیں۔

احتجاج طبرسی میں امام کا ابو حنیفہ کے ساتھ ہونے والا مناظرہ نقل ہوا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ابو حنیفہ اہل قیاس تھے یعنی مسائل کو ایک دوسرے سے جوڑتے تھے اور پھر جس مسئلے کا حکم معلوم ہوتا تھا اس کے مشابہ مسئلے پر اسی کے مشابہ حکم لگادیتے تھے۔ اس طرح ابو حنیفہ کے اکثر فتوؤں کا مبنیٰ رای اور قیاس ہے، برخلاف حنبلیوں کے کہ وہ حدیث اور منقول سے زیادہ استفادہ کرتے ہیں۔ حنبلی سب سے پہلے قرآن سے استناد کرتے ہیں اور وہ بھی ظواہر قرآن سے مثلاً قرآن میں آیا کہ " اولا مستم النساء "یعنی جن چیزوں کے بعد نماز کے لئے غسل یا تیمم کرنا ضروری ہے ان میں "لمس النساء" بھی ہے۔ یہاں " لمس" سے مراد جماع ہے لیکن حنبلیوں کے بقول "لمس" سے مراد وہی لمس کرنا اور چھونا ہے۔

"افق حوزہ" میگزین میں ابھی حال ہی میں علامہ عسکری کا سوڈانی علماء سے مناظرہ شائع ہوا ہے۔ علامہ نے سوڈانی علماء سے بحث کی تھی جن میں سے ایک شافعی تھے۔ علامہ نے ان سے پوچھا کہ امام شافعی کا فتویٰ ہے کہ "لمس النساء" سے وضو باطل ہو جاتا ہے۔ شافعی نے یہ بات کہاں سے اخذ کی ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو باطل ہو جاتا ہے۔

شافعی عالم جواب دیتے ہیں کہ اس آیت کے ظاہر سے " اولا مستم النساء "۔ یہ شافعی تھے اسی طرح حنبلی افراد ظواہر آیات اور ظواہر روایات سے بہت زیادہ چپکے ہوئے ہیں۔ مجاز کو نہیں مانتے۔

ہر مجاز کو حقیقت پر حمل کرتے ہیں جبکہ ہر زبان میں مجاز کا استعمال عام ہے۔ بہر حال ابو حنیفہ اہل قیاس تھے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام ابو حنیفہ کو سمجھانا چاہتے تھے کہ قیاس نہ کیا کرے۔ ہر جگہ قیاس سے صحیح نتیجہ اخذ نہیں ہوتا ہے اور فقہ و فتویٰ وحی سے ماخوذ ہونا چاہیے نہ کہ اپنی ذاتی رای سے۔ اسے سمجھانے کے لئے آپ نے ابو حنیفہ سے چند سوالات کئے۔

آپ نے پوچھا کہ بتاؤ نفس محترمہ کے قتل میں گناہ زیادہ ہے یا زنا میں۔ ابو حنیفہ نے کہا: قتل میں اور یہ درست بھی ہے۔

خداوند متعال فرماتا ہے " مَنۡ قَتَلَ نَفۡساً . . . . فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاس جميعاً "(جو کسی ایک انسان کو قتل کرے گویا اس نے سارے انسانوں کو قتل کر دیا ہے) یا دوسرے مقام پر فرماتا ہے:

" ومن يقتل مومناً متعمّداً فجزاؤه جهنم خالدًا فيها "(جو کسی بندۂ مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے اس کی سزا جہنم ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا)۔ حضرت نے پوچھا کہ قتل کا مفسدہ اور گناہ زیادہ ہے یا زنا کا؟ ابو حنیفہ نے کہا: قتل کا۔

آپ نے فرمایا: اگر ایسا ہے تو پھر کیوں قتل کے ثبوت کے لئے دو گواہ کافی ہوتے ہیں لیکن زنا کے ثابت ہونے کے لئے چار گواہوں کا ہونا ضروری ہے؟

اگر اس مسئلے کو عقل سے حل کر سکتے ہو تو کر کے دکھاؤ کہ اس کا راز کیا ہے؟ ابو حنیفہ کوئی جواب نہ دے سکے۔

حضرت نے پھر پوچھا کہ بتاؤ منی کی نجاست زیادہ ہے یا پیشاب کی ؟ابو حنیفہ نے کہا: پیشاب کی۔ آپ نے فرمایا: اگر پیشاب کی نجاست زیادہ ہے تو ایسا کیوں ہے کہ پیشاب کے بعد صرف نجس مقام دھل دینا کافی ہے لیکن منی نکلنے کے بعد غسل کرنا واجب ہے ؟ عقلی بنیاد پر بڑی نجاست کے ازالہ کے لئے غسل کا حکم ہونا چاہیئے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے ؟

پھر حضرت نے تیسرا سوال کیا کہ بتاؤ نماز کی اہمیت زیادہ ہے یا روزہ کی ؟ابو حنیفہ نے کہا نماز کی آپ نے فرمایا: اگر نماز کی اہمیت زیادہ ہے تو پھر ایسا کیوں ہے کہ عورت سے حالت حیض میں جو نمازیں چھوٹتی ہیں اس پر ان کی قضا واجب نہیں ہے لیکن مذکورہ حالات میں جو روزے چھوٹتے ہیں ان کی قضا واجب ہے ؟

عقل کی روشنی میں نماز کی قضا واجب ہونی چاہیے اس لئے کہ نماز کی اہمیت روزہ سے زیادہ ہے۔ امام علیہ السلام ابو حنیفہ کو متوجہ کرنا چاہتے تھے کہ عقل اور قیاس کو بنیاد بنا کر سارے کے سارے فقہی مسائل حل نہیں کئے جا سکتے۔

جو حضرات کچھ دیر سے تشریف لائے ہیں ان کی خدمت میں عرض کر دوں کہ ناچیز کو جہاں کہیں بھی کسی جلسے میں تقریر کے لئے بلایا جاتا ہے تو اگر بانیان جلسہ کی طرف سے کوئی پابندی نہ ہو تو میں جلسے کا زیادہ وقت سامعین کے سوالات کے لئے مخصوص کر دیا کرتا ہوں خاص طور سے اس طرح کے علمی جلسات میں۔

میرا خیال ہے کہ اس طرح کے جلسات میں مقرر کی گفتگو کم سے کم ہونی چاہیے اس لئے کہ نہیں معلوم جو باتیں مقرر پیش کر رہا ہے وہ سامعین کے لئے مفید بھی ہیں یا نہیں ؟ ہو سکتا ہے سننے والوں کے نزدیک ان کے اذہان میں موجود سوالات کی اہمیت مقرر کی گفتگو سے زیادہ ہو لہذا میرے خیال سے جلسہ کا بقیہ وقت سوالات و جوابات سے مخصوص کر دیا جائے تا کہ اپنی استطاعت بھر آپ کے سوالات کے جوابات عرض کئے جا سکیں.

صادق آل محمد علیہ السلام کا، ثقافتی انقلاب

منہال رضا خیر آبادی

پیغمبر اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اپنی ترسٹھ سالہ حیات طیبہ میں علم وفرہنگ کی تخم ریزی عرب کے ریگزار میں حوصلہ شکن و مشکل ترین حالات کے باوجود کی تھی تاکہ بشریت کو جادہ علم و عرفان، فرہنگ و تمدن سے آشنا کیا جاسکے، اس پودے کو خون جگر سے سیراب کر کے حیوان صفت افراد کو انسان اور درندہ خو روسائ قبائل کے دلوں میں رافت وعطوفت کو جاگزین فرمایا تھا، وصال پیغمبر اکرم ﷺ کے فورا بعد جہالت وجاہلیت کے خوگروں کے ہاتھوں فتنہ وفساد کے باد سموم میں پودہ مرجھانے لگا تھا گرچہ عالم اسرار ربانی، عالم علم لدنی، مظہر صفات وکمالات الہی، نفس رسالت خداوندی حضرت علیؑ نے اپنی عصمتی تدابیر سے سوکھنے اور مرجھانے نہیں دیا وقتا فوقتا اسکی آبیاری کرتے رہے۔

تاریکیوں کے دلدادہ چند گنے چنے افراد نے علم وفرہنگ کے اختر تاباں پر خلافت وملوکیت کی گرد ڈالکر اس کی روشنی کو مدھم کرنے کی انتھک کوششیں کی مگر خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہوئے، علم و دانش، فرہنگ وثقافت کی عطر آگین فضا کو متعفن کرنے کی کوششیں ہوتی رہیں مگر 'ینحدر عنی السیل ولا یرقی الی الطیر' (مجھ سے علم وعرفان کے چشمے پھوٹتے ہیں طائران فکر وخیال کی میرے ایوان عظمی کی اونچائی تک رسائی نہیں ہے) کا حامل اپنے علم وعرفان کی خوشبو سے فضائے عالم کے تعفن کو ختم کرتا رہا۔

فتنہ وفساد کے رسیا تانے بانے بنتے رہے مگر فرہنگ وثقافت اور علم ودانش کی اس آفاقی تحریک جسکی تشکیل وتاسیس دست رسالت کے ذریعہ عمل میں آئی تھی اس کے اثرات وبرکات کو محو، نہ کرسکے ہاں وقتی طور پر اس کی گرفت کمزور ہوئی جس کے نتیجہ میں خوف وہراس، حقائق ومعارف سے دوری، انسانی کمالات وفضائل سے عاری ایک گروہ تیار ہوگیا جس کے آثار شوم آج بھی عالم اسلام میں گاہے بگاہے نظر آتے رہتے ہیں اس دور میں بنی ہاشم اور چند مخلص ومتدین افراد کے علاوہ ہر ایک اس فتنہ سے متاثر ہوگیا کچھ اس فتنہ کا حصہ بن گئے کچھ کو خرید لیا گیا کچھ سادہ لوح افراد کو دھوکے کے ذریعہ اس فتنہ کی آگ کو شعلہ ور کرنے کیلئے اس کا حصہ بنادیا گیا اور اس طرح بشریت کو دھیرے دھیرے زوال وانحطاط کے کھنڈر میں ڈھکیل دیا گیا۔

امیر کائنات حضرت علی ابن ابی طالب (علیہما السلام) نے اس فتنہ کے وسیع ہونے کے اسباب وعلل کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: لَمْ يَسْتَضِيئُوا بِأَضْوَاءِ الْحِكْمَةِ - وَلَمْ يَقْدَحُوا بِزِنَادِ الْعُلُومِ الثَّاقِبَةِ - فَهُمْ فِي ذَلِكَ كَالْأَنْعَامِ السَّائِمَةِ - وَالصُّخُورِ الْقَاسِيَةِ قَدِ انْجَابَتِ السَّرَائِرُ لِأَهْلِ الْبَصَائِرِ - وَوَضَحَتْ مَحَجَّةُ الْحَقِّ لِخَابِطِهَا - وَأَسْفَرَتِ السَّاعَةُ عَنْ وَجْهِهَا - وَظَهَرَتِ الْعَلَامَةُ لِمُتَوَسِّمِهَا - مَالِي أَرَاكُمْ أَشْبَاحاً بِلَا أَرْوَاحٍ - وَأَرْوَاحاً بِلَا أَشْبَاحٍ - وَنُسَّاكاً بِلَا صَلَاحٍ - وَتُجَّاراً بِلَا أَرْبَاحٍ - وَأَيْقَاظاً نُوَّماً - وَشُهُوداً غُيَّباً - وَنَاظِرَةً عَمْيَاءَ - وَسَامِعَةً صَمَّاءَ - وَنَاطِقَةً بَكْمَاءَ[1]

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۰۸

ان ظالموں نے حکمت کی روشنی سے نور حاصل نہیں کیا اور علوم کے چقماق کو رگڑ کر چنگاری نہیں پیدا کی۔
اس مسئلہ میں ان کی مثال چرنے والے جانوروں اور سخت ترین پتھروں کی ہے۔ بے شک اہل بصیرت کے لئے اسرار نمایاں ہیں اور حیران و سرگرداں لوگوں کے لئے حق کا راستہ روشن ہے۔ آنے والے وقت نے اپنے چہرہ سے نقاب الٹ دی اور تلاش کرنے والوں کے لئے علامتیں ظاہر ہو گئی ہیں آخر کیا ہو گیا ہے کہ میں تمہیں بالکل بے جان پیکر اور بلا پیکر روح کی شکل میں دیکھ رہا ہوں۔ تم وہ عبادت گذار ہو جو اندر سے صالح نہ ہو اور وہ تاجر ہو جس کو کوئی فائدہ نہ ہو۔ وہ بیدار ہو جو خواب غفلت میں ہو اور وہ حاض ہو جو بالکل غیر حاضر ہو۔ اندھی آنکھ ' بہرے کان اور گونگی زبان '
سیاسی بازیگر اور صاحبان مسند نے فتنہ گروں کی ہمہ جہت حمایت وتائید کے ذریعہ اپنے لئے رائے عامہ ہموار کرنے کی ہر ممکن کوشش کیا، اجماع، شوری، استخلاف جیسے کھوکھلے قوانین کے سہارے علم وعرفان کے سیل رواں پر سد سکندری باندھنے کیلئے زبان وقلم، فکر وخیال کی خرید وفروخت سے لیکر قید وبند، قتل وغارتگری جیسے گھنائونے اور انسانیت سوز جرائم کے ارتکاب سے بھی گریز نہیں کیا، دار ورسن، تبعید و دربدر، آزار واذیت مظلم وستم روا رکھا گیا۔ علم وفرہنگ کا جہاں کہیں ایک بھی چراغ سحری نظر آجاتا اسکو بجھانے کے ہزار جتن کئے جاتے تاکہ حقائق پر تاریکی کی چادر اتنی دبیز ہو جائے کہ جنھوں نے ابھی صحن اسلام میں آنکھیں کھولی ہیں انھیں حقیقت نظر نہ آئے اور کچھ باطل دھندھلکے سایہ ہی حقائق کا روپ دھار لیں بظاہر اس شاطرانہ چال میں انھیں کامیابی بھی ملی مگر یہ حقیقت بھی ہر چشم بینا کے لئے روشن ہے کہ معدودی چند ہی چراغ علم وعرفان صحیح تھے ضرور۔ جنکی روشنی ارباب بصیرت، طالبان حق وحقیقت کی زندگیوں کو منور کرتی رہی۔
تاریخ کا ہر انصاف پسند طالب علم اس حقیقت سے باخبر ہے کہ اندھیروں کے ان سوداگروں، تاریکیوں کو پھیلانے والے اس گروہ میں بھی مرور ایام کے ساتھ دراڑیں پڑتی نظر آنے لگیں، مدت مدید تک اندھیروں کا راج ضرور رہا مگر گھٹاٹوپ اندھیروں میں نور علم وفرہنگ کی کرن کہیں کہیں ضرور پردہ بصارت سے ٹکرا کر اپنے وجود کا پتہ دیتی رہی اور حق جو وحقیقت طلب ذہنوں، فکروں اور شعور کو منور کرتی رہی۔
علم وجہل، نور وظلمت، اندھیرے اجالے کی باہمی کشمکش کا جو سلسلہ وفات مرسل اعظم ﷺ کے بعد شروع ہوا تھا وہ روز بروز بڑھتا رہا مگر ہر عروج کو زوال اور ہر ترقی کا انحطاط بھی مسلمہ حقیقت ہے جو اس سلسلہ میں بھی نظر آتا ہے بنی امیہ کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں اور بنی عباس توانا وتندرست ہو رہے تھے دونوں گروہ میں سیاسی چپقلش، جنگ وجدال کا رخ اپنا رہی تھی ایسے حالات میں امام محمد باقر وامام جعفر صادق علیہم السلام نے موقعہ وفرصت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا بلکہ علم وفرہنگ پر پڑی برسوں کی دبیز گرد کو اپنے تیشہ حکمت سے کھرچ کر صاف وشفاف بنانے کا مستحکم منصوبے کو عملی جامہ پہنایا اندھیروں کا راج ختم ہوتا گیا اجالے کی حکمرانی قائم ہو گئی جہالت کافور اور علم کا بول بالا ہو گیا۔
امام جعفر صادق نے حالات کی سیاسی ابتری سے خوب استفادہ کیا اور اساسی وبنیادی اقدامات انجام دیئے، دین فروش علما اور نامراد وناکام حکام وسلاطین کے ذریعہ فرہنگ ناب اسلامی کی تحریف کا عمل جو برسوں سے چلا آرہا تھا اسکی اصلاح، حقیقی

فرہنگ کی تبیین و تشریح، تبلیغ وترویج کا عمل انجام دیا اور ایک نا قابل یقین فرہنگی انقلاب برپا کیا جس کا اعتراف ہر علم دوست، منصف مزاج کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

مورخین وسیرت نگاروں کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ امام کے ذریعہ لائے گئے فرہنگی انقلاب کی تقویت وہمہ گیری کا ایک سبب اور راز یہ تھا کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں اسلامی فرہنگ کا غیر اسلامی فرہنگ سے صمیمانہ رابطہ قائم ہوا جس کے بعد علمی مرکز "بیت الحکمت"[1] کی تاسیس عمل میں آئی عربی زبان میں کتابوں کے ترجمے ہوئے، جدید نسل جو ابھی ابھی دائرہ اسلام میں آئی تھی وہ مختلف اقوام وملل سے رابطہ میں تھی جس کے نتیجہ میں ان کے فکری وعلمی مواد عالم اسلام میں وارد ہورہے تھے گرچہ اس فکری وفرہنگی تبدیلی کے مثبت اثرات بھی تھے لیکن منفی اثرات زیادہ تھے مسلمانوں میں اغیار کے افکار کا نفوذ جس کے سبب مختلف مکاتب فکر نے جنم لینا شروع کردیا جو عالم اسلام کیلئے بہت عظیم خطرہ بنتا جارہا تھا۔ایک طویل عرصہ تک مسلمانوں کی نئی نسل فضائے عالم پر چھائی ہوئی خوف وہراس کی دبیز چادر کے باعث، اسلامی معاشرہ میں غیر معقول سیاسی حکمرانی اور حقائق کی تبیین وتشریح کی مسدود راہوں نے حقیقی اسلام کے مبادیات کو بھی ذہنوں سے دور کردیا تھا حالات اتنے ابتر تھے کہ پہلے خلیفہ عباسی کے تخت حکومت پر بیٹھنے کے بعد شام کا ایک گروہ مبارکباد کیلئے دربار میں حاضر ہوا تو قسم کھاکر کہتا ہے ہمیں نہیں پتہ تھا کہ بنی امیہ کے علاوہ بھی نبی اکرم ﷺ کا کوئی قرابتدار ورشتہ دار ہے لیکن جب آپ نے قیام کیا تو ہمیں معلوم ہوا[2]

اسلامی معاشرہ پر چوطرفہ فرہنگی حملہ ہورہا تھا، علمی مباحثات، مناظرہ کلامی کا بازار گرم تھا، ہر صبح ایک نئے مکتبہ فکر کے ساتھ طلوع ہورہی تھی، ہر مکتبہ فکر اپنے عقائد وافکار کی ترویج کیلئے علمی مسندیں سجائے ہوئے تھا، مجادلہ کا اسلوب عام ہوگیا تھا امام نے محسوس کیا علم کی مستحکم وجامع تحریک چلانا لازم وضروری ہے کیونکہ عصر امام صادق میں سر اٹھانے والا فتنہ ماضی کے فتنہ سے زیادہ خطرناک تھا یہ زمانہ افکار وعقائد کی جنگ کا زمانہ تھا، فرق ومذاہب کے ٹکراو کا دور تھا، قرآنی مباحثات پر دو گروہ باہم دست وگریباں تھے، تفسیر وتاویل پر مختلف نظریات متصادم، نام نہاد علما کرسی فقاہت پر براجمان تھے جو خود ساختہ وجعلی روایات کے سہارے فقہی مسائل بیان کررہے تھے، قیاس واستحسان کو دلیل شرعی سمجھا جانے لگا تھا، شہروں اور کوچوں میں ایسے فقہا کی بھیڑ نظر آتی تھی، حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی فقہ کے علاوہ حسن بصری، سفیان ثوری جیسے افراد رہبران مذہب کے نام سے پہچانے جاتے تھے جن کے چشم وابرو کے اشارے پر مرید گردش پرکار بنے ہوئے تھے، علم کلام کے مسائل پر ہیجان انگیز بحث ومباحثے عام تھے جسکا اثر معتزلہ، اشاعرہ، مرجئہ ودیگر ٹکڑوں کی صورت میں اسلامی سماج میں پنپ رہا تھا، زندیق کے مردہ پیکر میں تازہ روح پھونکنے کی سعی ناکام ہورہی تھی[3] ان ناگفتہ بہ حالات میں امام جعفر صادقؑ نے جو اقدامات کئے انکا جائزہ

---

[1] یہ ایک علمی مرکز تھا جو مامون عباسی کے ذریعہ بغداد میں قائم ہوا، ایک عظیم کتابخانہ کی تاسیس عمل میں آئی جس میں مترجمین کے ایک گروہ کی مدد سے کتابوں کے ترجمے کا کام انجام پاتا۔ تفصیلات کیلئے لغتنامہ دہخدا کا مطالعہ کریں

[2] مروج الذہب ج ۳، ص ۳۳

[3] سیری در سیرہ ائمہ اطہار مولفہ شہید مطہری، ص ۱۴۶

ہمیں اس نتیجہ پر پہونچاتا ہے کہ اگر امام کی عصمتی نگاہیں نہ ہوتیں تو شیرازہ اسلام ایسا بکھر جاتا کہ پھر اکٹھا کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ مشکل و دشوار ہوتا۔

امام جعفر صادق اور ثقافتی اقدامات:

صادق آل محمدؑ نے دین اسلام کے دفاع اور اسکی تبلیغ وترویج کی خاطر مختلف النوع ذرائع کو اختیار فرمایا، مناظرہ، علمی مباحثات، مستحکم ومتقن دلائل وبراہین کے ذریعہ ریت پر قائم مذاہب ومکاتب کی بنیادوں کو تہس نہس کردیا اسلامی معاشرہ میں علمی وفکری انقلاب ایسا برپا کیا کہ تشنگان علوم ومعارف کا ایک جم غفیر اکٹھا ہوگیا اور چشمہ زلال معارف الٰہیہ سے گھونٹ گھونٹ پیکر سیراب ہونے لگا۔

امام نے مختلف علوم وفنون کے مردہ اجسام میں تازہ روح پھونک دیا علوم قرآن، تفسیر وحدیث، فقہ وکلام، طب وفلسفہ، نجوم وریاضیات کے بنیادی اصولوں کو زندگی عطا کیا اور ایسی تبدیلی پیدا کیا کہ جس سماج ومعاشرہ میں علم ودانش کی باتیں عجوبہ سمجھی جاتی تھی اسی سماج وسوسائٹی میں فکری وعلمی سرمایہ داروں کی بھیڑ نظر آنے لگی، علم وعرفان کا بازار سج گیا اور متاع فکر وفرہنگ کے قدرداں کی رفت وآمد شروع ہوگئی برسوں سے ویران پڑی مسجد نبوی تشنگان علوم سے چھلک اٹھی شاگردوں کا ایک عظیم لشکر تیار کیا جو ہر محاذ علمی پر ایک ماہر فن بنکر مقابلہ کیلئے ڈٹ گیا تاریخ آدمیت میں علم وفن کا ایسا سنہرا دور نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

مکتب صادق کے تربیت یافتہ ہشام بن حکم، مومن طاق، محمد بن مسلم اور زرارہ بن اعین وہ روشن ستارے ہیں جنکی روشنی جہالت کی گہرائی وگیرائی نیز وسعتوں کو ناپنے کیلئے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، علم وفرہنگ کا یہ سیلاب نہ جغرافیائی حد بندیوں میں قید کیا جاسکا نہ سازشی تانے بانے روک سکے دیکھتے دیکھتے پورے عالم انسانیت سے جہالت وجاہلیت کے خس وخاشاک کو وادی نسیاں کی زینت بناگئے علم وفرہنگ کا چراغ آج بھی روشن وتابندہ ہے۔

خوف طوالت کے پیش نظر ہم اس مضمون میں امام کے چند اہم اقدامات کا فہرست وار تذکرہ ہدیہ ناظرین کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں:

۱۔امامت کی عظمت رفتہ کی بازیابی: اسلامی سماج میں اموی وعباسی خلفا کی غلط پالیسیوں کے باعث مقام امامت متروک اور عظمت منصب خلافت پائمال ہورہی تھی درباری علما کو عوام میں متعارف کراکے عوام کو ائمہ معصومینؑ سے دور کیا گیا مگر وہ عظمت رفتہ پھر عصر امام صادقؑ میں اہلبیتؑ کی طرف لوٹی امام صادقؑ نے مختلف مواقع پر مسئلہ امامت کی اہمیت وافادیت کو پیش کرکے ذہنوں میں راسخ کیا، عمرو بن ابی مقدام بیان کرتا ہے نویں ذی الحجہ روز عرفہ میدان عرفات مین خلائق کا اژدحام ان خاص اعمال کو انجام دینے کے لئے دنیا کے گوشہ وکنار سے جمع ہوا تھا امام نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پیغام دیا:

ایھا الناس ان رسول اللہ کان الامام ثم کان علی بن ابی طالب ثم الحسن ثم الحسین ثم علی بن الحسین ثم محمد بن علی ثم ....[1] اے لوگو! اللہ کی طرف سے رسول خدا امام تھے پھر علی پھر حسن پھر حسین پھر علی ابن الحسین

---

[1] بحار الانوار، ج ۴۷، ص ۵۸)

پھر محمد ابن علی علیہم السلام۔امام نے باآواز بلند فرمایا آواز اتنی بلند تھی گویا ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا اور حجاج کے عالمی اجتماع کے ذریعہ اپنا پیغام دنیا کے گوشہ وکنار تک پہونچایا، روایت کی لفظوں سے پتہ چلتا ہے کہ امام نے تین مرتبہ اس پیغام کی تکرار کی اور ہر سمت رخ بدل بدل کر تین بار پیغام سنایا جو خود اپنے آپ میں پیغام کی اہمیت وعظمت کا پتہ دیتا ہے۔

۲۔شاگردوں کی تعلیم وتربیت: سیاسی حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور سماج کی ضرورتوں کے پیش نظر جس علمی وفرہنگی تحریک کی بنیاد امام محمد باقرؑ نے رکھی تھی اس کے استحکام، توسیع، اور جامعیت وہمہ گیریت کے تمام مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا چنانچہ اہل سنت کے چاروں فقہی مذاہب کے آئمہ بالواسطہ یا بلا واسطہ آپ کی شاگردی میں رہے، ''لولا السنتان لهلك النعمان'' آج تک آپ کی علمی جلالت کا بزبان دشمن زندہ قصیدہ ہے۔اس کے علاوہ شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے جسمیں ہر ایک اپنے فن کا نابغہ نظر آتا ہے۔

۳۔معاشرتی اخلاق کی ترویج ومسالمت آمیز طرز معاشرت: آئمہ معصومینؑ نے ہمیشہ سماجی اصولوں اور اجتماعی اخلاق کے دنیوی واخروی فوائد وبرکات کا تذکرہ اور تاکید فرمائی ہے اپنے چاہنے والوں سے ہمیشہ یہی مطالبہ کرتے کہ حتی المقدور برادرانہ انداز، صلح وصفا کے ساتھ زندگی بسر کریں امام صادقؑ نے فرمایا تھا: اللہ مدارات کرنے والا ہے اور مدارات کو دوست رکھتا ہے اور لوگوں کی مدارات کی راہ میں امداد کرتا ہے[1]

امام نے ہمیشہ شیعوں کو اس بات کی تاکید فرمایا کہ سماج میں بسنے والے دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ مسالمت آمیز رویہ اختیار کرو تاکہ شیعہ سماج اکثریت سے الگ تھلگ نہ ہونے پائے۔

۴۔تجلیل علم وتکریم علما: امام جعفر صادقؑ نے اپنے شاگردوں کو تحصیل علم ومعرفت کا شوق دلایا ان سے فرماتے تھے میں جوانوں کو دو حالت میں سے ایک حالت میں دیکھنا چاہتا ہوں یا عالم ہو یا طالب علم، ورنہ دونوں مقصر ہوں گے اور ہر تقصیر کرنے والا گمراہ اور ہر گمراہ گنہگار ہے[2]

کائنات امام جعفر صادق کی اس علمی تحریک کی مدیون ہے جس نے معارف الٰہیہ کے مرجھاتے ہوئے باغ کو سبزہ زار بنادیا، انوار علم وعرفان سے کائنات روشن ہوگئی، اوہام وباطل عقائد کا گھروندا تہس نہس ہوگیا اس عظیم تحریک کی جامعیت، افادیت، فوائد وبرکات نیز اثرات دیکھکر دنیا دم بخود ہے جہالت کے پروردہ کف افسوس مل رہے ہیں وعدہ پروردگار تبسم ریزی کر رہا ہے دشمن اسلام وقرآن حسرت ویاس سے تک رہے ہیں۔

یہ چند سطریں مشتی نمونہ از خروارہ کے عنوان سے قلم بند کر دیا ہے ورنہ اس عنوان کے چند صفحات ناکافی ہیں اور مجھ سے طالبعلم کی سطح علمی سے بہت بالاتر۔خدایا ہمیں انھیں انوار کے طفیل اپنے معارف کی روشنی عطا کر۔

---

[1] وسائل الشیعہ، ج۱۵، ص۲۷۱

[2] صفحاتی از زندگانی امام جعفر صادق، محمد حسین مظفر، ص۲۲۰

امام صادق علیہ السلام اور غالیوں سے مقابلہ کی راہیں

تحریر: حجۃالاسلام علی رضاانصاری/ ترجمہ: فیروز علی بنارسی

آئمہ معصومین علیہم السلام کے درمیان امام جعفر صادق علیہ السلام کا دور سب سے الگ دور تھا۔ آپ کے دور میں ایسے سماجی اور ثقافتی حالات پائے جاتے تھے جو کسی بھی امام علیہ السلام کے دور میں نہیں دکھائی دیتے اس لئے کہ وہ زمانہ سیاسی نقطۂ نظر سے بنی امیہ کے اقتدار کے کمزور اور متزلزل ہونے اور بنی عباس کی طاقت و قوت میں اضافہ کا دور تھا اور یہ دونوں قبیلے ایک مدت تک کشمکش اور لڑائی جھگڑے کا شکار تھے۔

ہشام بن عبد الملک کے دور سے بنی عباس کی سیاسی پروپگنڈے اور لڑائی کا دور شروع ہوا اور ۱۲۹ سنہ ھ میں اسلحوں کی جنگ اور فوجی کاروائیوں تک پہونچ گیا۔ آخر کار ۱۳۲ سنہ ھ میں بنی عباس کامیاب ہوگئے۔ چونکہ بنی امیہ اس مدت میں بہت سی سیاسی مشکلات میں گرفتار تھے لہٰذا، انھیں امام علیہ السلام اور شیعوں پر دباؤ بنانے کی فرصت نہیں مل سکی بنی عباس بھی چونکہ حکومت تک پہنچنے سے پہلے آل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت و طرفداری اور ان کے خون ناحق کابدلہ لینے کے عنوان سے کھڑے ہوئے تھے ان کی جانب سے بھی اس دور میں دباؤ نہیں بن پایا۔ لہٰذا یہ زمانہ کسی حد تک امام صادق علیہ السلام اور آپ کے شیعوں کے لئے سکون کا دور تھا اور ان حضرات کے لئے علمی و ثقافتی سرگرمیاں انجام دینے کا بہت بڑا موقع ہاتھ آگیا تھا۔ فکری اور ثقافتی نقطۂ نظر سے امام جعفر صادق علیہ السلام کا دور فکری اور ثقافتی تحریک کا دور تھا۔ اس زمانہ میں امت مسلمہ میں علمی ذوق و شوق بہت زیادہ تھا اور مختلف علوم چاہے وہ اسلامی علوم ہوں جیسے: قرائت قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام وغیرہ چاہے انسانی یعنی عصری علوم جیسے طب، فلسفہ، نجوم، ریاضی وغیرہ وجود میں آئے تھے۔ دوسری جانب امام صادق علیہ السلام کا زمانہ عقائد و نظریات کے ٹکراؤ اور مختلف فرقوں اور مذاہب کے وجود میں آنے کا زمانہ تھا۔ معتزلہ، جبریہ، مرجئہ، غلات، زنادقہ جیسے فرقے اپنے اپنے عقائد کی ترویج و تبلیغ کررہے تھے۔

اسی دوران غالیوں کے افکار و نظریات نے بھی قابل توجہ ترقی کی اور انھوں نے مختلف شکل و صورت میں اپنے عقائد کا اظہار کیا درحالیکہ وہ اپنے آپ کو امام صادق علیہ السلام کا پیرو جانتے اور بتاتے تھے۔ اس طرز تفکر کے ساتھ وہ وہ شیعوں کے حقیقی اور سچے عقائد کو خراب کرنے اور اپنے عقائد کو پھیلانے کے درپے تھے۔

غلو اور غالی

لغت میں غلو حد سے بڑھ جانے اور حد اعتدال سے باہر نکلنے کے معنیٰ[1] میں ہے۔

قرآن کریم نے اہل کتاب سے فرمایا: یَآَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ؛[2]

---

[1] تصحیح الاعتقاد، ص ۱۰۹؛ لسان العرب، ج ۱۵، ص ۱۳۳؛ الصحاح، ج ۶، ص ۲۴۴۸؛ مقاییس اللغۃ، ج ۴، ص ۳۸۷؛ المصباح المنیر، ج ۲، ص ۴۵۲.

[2] سورۂ نساء (۴) آیت ۱۷۱

اے اہل کتاب اپنے دین میں حد سے تجاوز نہ کرو اور خدا کے بارے میں حق کے علاوہ کچھ نہ کہو۔

اصطلاح میں غلو کی کئی تعریفیں کی گئی ہیں:

۱۔ کسی بندہ یا فرد کو مخلوق اور بندہ ہونے کے مقام سے اوپر لے جانا اور اس بات کے قائل ہونا کہ وہ الوہیت، معبودیت، خالقیت اور رازقیت میں خدا کے شریک ہیں۔

۲۔ یا کسی ایسی بات کا قائل ہونا جو ان چاروں چیزوں میں سے کسی ایک کا لازمہ ہو جیسے روح خدا کا ان افراد میں حلول کر جانا۔

۳۔ یا اس بات کا قائل ہونا کہ خداوند عالم نے انھیں خلق کرنے کے بعد خلقت کو ان کے حوالہ کر دیا ہے۔

۴۔ یا اس بات قائل ہو جائیں کہ ان حضرات نے انتقال نہیں کیا ہے، وہ آسمان پر چلے گئے ہیں۔

علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے غلو کے مظاہر اور جلوے کو مندرجہ ذیل عقائد میں قرار دیا ہے:

۱۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی الوہیت کا قائل ہونا۔

۲۔ ان حضرات کو معبودیت یا خالقیت، یا رازقیت میں خدا کا شریک قرار دینا۔

۳۔ خدا کے ان حضرات کے اندر حلول کر جانے یا خدا کے ان کے ساتھ مل کر ایک ہو جانے کا عقیدہ رکھنا۔

۴۔ وحی و الہام کے بغیر ان کے علم غیب کا قائل ہونا۔

۵۔ آئمہ طاہرین علیہم السلام کے سلسلہ میں نبوت کا قائل ہونا۔

۶۔ آئمہ علیہم السلام کے ارواح کے ایک دوسرے بدن میں تناسخ کا قائل ہونا۔

۷۔ آئمہ معصومین علیہم السلام کی معرفت کو دلیل بنا کر خدا کی اطاعت نہ کرنا اور خدا کی نافرمانی کو ترک نہ کرنا[1]۔

غالی وہ شخص ہے جو مذکورہ بالا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ میں معتقد ہو جیسے نصیری فرقہ کہ یہ لوگ قائل تھے کہ حضرت علی علیہ السلام خدا یا الوہیت آپ کے اندر حلول کر گئی ہے[2]۔

یا منصوریہ فرقہ جو اس بات کا قائل تھا کہ امام محمد باقر علیہ السلام آسمان پر چلے گئے ہیں یا فرقہ "جناحیہ" جو اس بات کا قائل تھا کہ روح خدا جناب آدم اور بعد کے انبیاء میں حلول کر گئی ہے[3]۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا غلو اور غالیوں سے مقابلہ

جیسا کہ بیان کیا گیا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانہ میں غلو اور غالیوں نے قابل توجہ ترقی کی اور یہ مسئلہ اہل بیت علیہم السلام کی منزلت کو مشکوک بنانے کا سبب بن رہا تھا اور لوگوں کو بھی حقیقی شیعوں کو غیر حقیقی شیعوں سے الگ کرنے میں مشکلات سے دچار کر رہا تھا۔ اس لئے کہ غالیوں کے عقائد اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات سے میل نہیں کھا رہے تھے۔ حقیقی شیعوں کے ساتھ ان کا برتاؤ بھی متضاد تھا۔

---

[1] بحار الانوار، ج ۲۵، ص ۳۴۶

[2] فرق و مذاہب کلامی، علی ربانی گلپایگانی، ص ۳۲۶.

[3] الفرق بین الفرق، عبد القاہر بغدادی، ص ۲۳۰

لہذا امام جعفر صادق علیہ السلام نے دیگر علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ غلو اور غالیوں کی طرف جھکاؤ سے بھی مقابلہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غالیوں سے کسی طرح کا رابطہ رکھنا یا ان کے ساتھ ذرا سی بھی ہمدردی بہت برے عقیدتی اور سماجی۔۔۔ نقصانات کا باعث بنتی۔ نیز حقیقی شیعوں کی حفاظت اور اسے مضبوط کرنے کی خاطر ضروری تھا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام علی الاعلان ان کا مقابلہ کریں اور ان کے باطل عقائد اور افکار و نظریات کو شیعوں کے دائرہ سے دور رکھیں اس لئے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج حقیقی شیعوں کا کوئی نام و نشان نہ ہوتا اور یہ مذہب ہوس پرستوں کا بازیچہ بن جاتا جو یہودیت اور عیسائیت سے متاثر ہو کر شیعیت کی ایک الگ ہی تصویر پیش کرتے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے مختلف طریقوں سے غالیوں اور غلو کے خلاف قدم اٹھائے ان میں سے بعض اہم اقدامات کو بیان کیا جارہا ہے۔

ا۔ ہوشیار و خبردار کرنا

امام جعفر صادق علیہ السلام کا پہلا اقدام شیعوں کو ہوشیار، خبردار اور چوکنا کرنا تھا کہ غالیوں سے قطع تعلق کریں اس لئے کہ ان سے کسی بھی قسم کا رابطہ رکھنا بہت برا اثر چھوڑے گا آپ نے اپنے شیعوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

غالیوں کے ساتھ نشست و برخاست نہ رکھو۔ ان کے ساتھ کھانا نہ کھاؤ۔ ان کی جانب دوستی کا ہاتھ مت بڑھاؤ اور ان سے علمی اور ثقافتی تبادلہ نہ کرو[1]۔

آپؑ شیعوں سے فرماتے تھے کہ اپنے جوانوں پر توجہ دیں، ان کا خیال رکھیں کہ کہیں غالیوں کے عقائد و افکار سے متاثر نہ ہو جائیں۔ اپنے جوانوں کو غالیوں سے دور رکھو تا کہ وہ انھیں خراب نہ کر سکیں، غالی اللہ کی بدترین مخلوق ہیں جو عظمت الٰہی کو کم کرتے ہیں اور اس کے بندوں کو خدا مانتے ہیں[2]۔

غالیوں کے عقائد کی تکذیب

امام جعفر صادق علیہ السلام غالیوں سے مقابلہ کے لئے ان کے عقائد کو رد کرتے تھے اور آپ نے ان کے عقائد کو غلط اور باطل قرار دے کر شیعہ احادیث اور عقائد کی اصلاح کی راہ میں ایک مناسب فکری تحریک چلائی۔ شہرستانی کی روایت کے مطابق سدیر صیرفی امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: میرے مولیٰ! آپ کے شیعہ آپ کے سلسلہ میں اختلاف نظر کا شکار ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں: ہر وہ بات کہ لوگوں کی ہدایت کے لئے جس کی امام کو ضرورت ہوتی ہے وہ ان کے کانوں میں کہہ دی جاتی ہے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ امام پر وحی نازل ہوتی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کے دل پر الہام ہوتا ہے ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ وہ خواب میں دیکھ لیتے ہیں۔ بالآخرہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے آباء و اجداد کی کتابوں سے فتویٰ دیتے ہیں۔ ان نظریات میں سے کون سا نظریہ صحیح ہے؟!

امام علیہ السلام نے فرمایا: اے سدیر! ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی صحیح نہیں ہے۔ ہم اللہ کی حجت اور اس کے منتخب بندوں پر اس کے امین ہیں۔ ہم خدا کے حلال و حرام کو کتاب خدا سے دریافت کرتے ہیں[3]۔

---

[1] اختیار معرفۃ الرجال، شیخ طوسی، ج ۲، ص ۵۸۶.

[2] امالی، ج ۲، شیخ صدوق، ص ۲۶۴

[3] حیات فکری و سیاسی امامان شیعہ، ص ۲۵۸

عیسیٰ حرجانی کہتے ہیں: میں نے جعفر بن محمد علیہما السلام سے عرض کی: میں نے ان لوگوں (غالیوں) سے جو کچھ سن رکھا ہے، انھیں بیان کروں ؟! امام علیہ السلام نے فرمایا: بیان کرو۔

میں نے عرض کی: ان لوگوں میں سے کچھ لوگ خدا کے بجائے آپ کی عبادت کرتے ہیں اور کچھ لوگ آپ کو نبی مانتے ہیں۔۔۔ وہ کہتے ہیں: جیسے ہی امام علیہ السلام نے ان باتوں کو سنا اس طرح گریہ فرمایا کہ آپ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: اگر خدا نے انھیں میری پہنچ میں قرار دے اور میں ان کا خون نہ بہاؤں تو خدا میرے بچوں کا خون میرے ہاتھوں سے ہی بہائے[1]۔

امام محمد باقر علیہ السلا کو امام مہدیؑ قرار دینا امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانہ کے غالیوں کے ہتھکنڈوں میں سے ایک تھا کہ جس کو امام صادق علیہ السلام نے باطل قرار دیا[2]۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس سلسلہ میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

خدا لعنت کرے ان لوگوں پر جو ہمیں اللہ کا نبی مانتے ہیں اور خدا لعنت کرے ان لوگوں پر جو اسے بارے میں شک کریں[3]۔

غالیوں کے افراطی عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ تھا کہ وہ لفظ ''الٰہ'' معبود امام کے لئے بولتے تھے اور کہتے تھے: **هو الذی فی السماء اله و فی الارض اله، قال: هو الامام**[4]۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس عقیدہ کے قائلین کو مجوس، یہود، عیسائی اور مشرکین سے بد تر قرار دیا ہے۔

تکفیر اور لعنت

امام صادق علیہ السلام کے غالیوں سے مقابلہ کا ایک دوسرا طریقۂ کار انھیں کافر قرار دینا اور ان پر لعنت کرنا ہے۔ امام علیہ السلام نے انھیں کافر کہہ کر ان کے عقائد کو بھی باطل کیا ہے اور اپنے شیعوں کے راستہ کو ان سے جدا کیا ہے۔ امام علیہ السلام نے انھیں دو مرحلے میں کافر قرار دیا ہے: پہلے مرحلہ میں آپ نے غالیوں کے لیڈروں اور سرغنہ اور دیگر افراد کو کافر قرار دیا ہے۔

امام علیہ السلام کے اس اقدام کی دلیل یہ تھی کہ غالیوں کے لیڈر اور سرغنہ غلو کو پھیلانے میں کافی اثر انداز تھے اور دوسری طرف ان کو کافر کہنا سبب بنتا تھا کہ دوسرے غلات ان کے ناپاک عزائم اور عقائد سے دوری اختیار کر لیں۔

دوسرے مرحلہ میں امام علیہ السلام نے ان غالیوں کو کافر قرار دیا جو ہدایت قبول نہیں کرتے تھے اور ہٹ دھرمی کا شکار تھے۔ آپ نے غالیوں کے ایک سرغنہ ابو الخطاب کے بارے میں فرمایا: خدا، فرشتوں اور سارے انسانوں کی لعنت ہو ابو الخطاب پر کہ وہ کافر، فاسق اور مشرک ہے[5]۔

---

[1] تاریخ جرجان، ص ۳۲۲-۳۲۳.

[2] اختیار معرفۃ الرجال، ص ۳۰۰.

[3] اختیار معرفۃ الرجال، ص ۳۰۰

[4] اختیار معرفۃ الرجال، ص ۳۰۱

[5] رجال کشی، ص ۳۴۲

نیز غالیوں کے ایک دوسرے سرغنہ بشار شعیری کے بارے میں فرمایا: وہ شیطان ابن شیطان ہے اور اس کا کام شیعوں کو گمراہ کرنا ہے[1]۔

کارآمد افراد کی تربیت:

امام جعفر صادق علیہ السلام نے غالیوں سے مقابلہ کے لئے بہت سے افراد کی تربیت کی اور انھیں تیار کیا۔ آپ کو معلوم تھا کہ ایسے اہم مسئلہ سے مکمل طور پر مقابلہ کے لئے کارآمد افراد کی تربیت کرنا اور انھیں اکٹھا کرنا ہے۔ لہٰذا آپ نے کچھ ایسے افراد تیار کئے جو اس آپ کے مشن کو جاری رکھ سکیں۔ آپ نے اپنے صحابی مفضل سے ابوالخطاب کے ساتھیوں کے بارے میں فرمایا :

اے مفضل! غالیوں کے ساتھ نشست و برخاست مت رکھو، ان کے ساتھ کھانا نہ کھاؤ اور ان سے دوستی کے لئے ہاتھ مت بڑھاؤ اور ان سے علمی ثقافتی لین دین اور تبادلہ مت کرو[2]۔

اگرچہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مفضل نے غالیوں سے قطع تعلق کر لیا لیکن امام علیہ السلام اس ارشاد کے ذریعہ ماحول بنانے اور اپنے اصحاب کو فکری ترقی دینا چاہتے تھے۔

آپ کے اصحاب اور شاگرد بھی غالیوں سے مقابلہ میں کامیاب رہے اس لئے کہ انھوں نے امام علیہ السلام کے مشن کو جاری رکھا اور ڈٹ کر غالیوں کا مقابلہ کیا اور اس اہتمام و انتظام نے غلو کو پھیلنے اور بڑھنے سے روک رکھا تھا اور غالیوں کی سرگرمیوں کو کافی حد تک کم کرنے میں اثر انداز ثابت ہوا تھا۔

غلو سے بچنے کا معیار بتانا:

امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے شیعوں کو نصیحت فرماتے تھے کہ اہل بیتؑ اور ان کی تعلیمات کو پہچاننے کے لئے قرآن کریم اور سنت نبوی کو معیار قرار دیں اور جو بات قرآن حدیث کے مطابق ہو اسے قبول کر لیں، ورنہ رد کر دیں۔ امام علیہ السلام شیعوں کو نصیحت فرماتے کہ آئمہ معصومین علیہم السلام کے بارے میں غلو نہ کریں۔ آپ فرماتے تھے:

غالیوں نے ہمارے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت نہیں ہے اور ہم انھیں نہیں مانتے ہیں، تم لوگوں نے ہماری زبان سے ہمارے بارے میں جو کچھ سنا ہے اسے مان لو۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے غالیوں کے انکار و نظریات کو رد کرتے ہوئے فرمایا: خدا لعنت کرے اس شخص پر جو ہمارے بارے میں ایسی بات کہے جو ہم نہیں کہتے ہیں۔ خدا لعنت کرے اس آدمی پر جو ہمیں اللہ کی عبودیت (بندگی) کے مرتبہ سے ہٹادے کہ جس نے ہمیں خلق کیا ہے۔ ہماری بازگشت اسی کی جانب ہے اور ہماری پیشانیاں (اختیار) اسی کے دست قدرت میں ہے[3]۔

نیز آپ نے شیعوں کو نصیحت فرمائی کہ اہل بیت علیہم السلام کی احادیث کو ماننے کے سلسلہ میں قرآن اور سنت نبوی کو معیار بنائیں یعنی وہ حدیث جو قرآن و سنت نبوی کے مطابق ہے اسے قبول کر لیں۔

---

[1] رجال کشی، ص ۱۹۵

[2] اختیار معرفۃ الرجال، ج ۲، ص ۵۸۶.

[3] میزان الاعتدال، ذہبی، ج ۳، ص ۹۸-۹۹.

ہم سے کوئی بھی حدیث قبول نہ کرو سوائے اس حدیث کے جو قرآن و سنت کے مطابق ہو یا ہماری گذشتہ حدیثوں میں اس پر کوئی شاہد و گواہ مل جائے[1]۔

امام علیہ السلام کا یہ ارشاد اس لئے تھا کہ غالی حدیثیں گڑھتے تھے اسی لئے امام علیہ السلام نے غالیوں کے ایک سردار اور سرغنہ مغیرہ بن سعد کے بارے میں فرمایا :

بے شک مغیرہ بن سعد کہ خدا اس پر لعنت کرے، اس نے بہت سی حدیثیں میرے والد کے اصحاب کی کتابوں میں داخل کر دی ہیں۔ یعنی گڑھ دی ہیں کہ جن کو آپ نے بیان بھی نہیں کیا ہے۔ پس تقویٰ اختیار کرو اور جو باتیں ارشاد الٰہی اور سنت نبوی کے خلاف ہوں انھیں قبول نہ کرو[2]۔

نیز امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ اصول عقائد اور دینی تعلیمات و معارف کو پہچاننے کے لئے قرآن و سنت کو معیار قرار دیں اس لئے کہ غالیوں نے جھوٹے اور باطل عقیدے پیش کئے ہیں اور وہ انھیں کی تبلیغ و ترویج کرتے تھے۔

ایسے ماحول تھا کہ امام علیہ السلام نے غالیوں سے مقابلہ کیا اور فرمایا :**توبوا الی اللہ فانکم فساق کفار مشرکون**[3]۔ خدا کی جانب پلٹ آؤ کہ تم فاسق، کافر اور مشرک ہو۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ان غالیوں نے کچھ باتیں سنی ہیں لیکن اس کی حقیقت کو نہیں سمجھ پائے ہیں اس لئے کہ انھوں نے دینی حقائق کو سمجھنے کے لئے اپنے نظریات کو بنیاد مان رکھا ہے اور اپنی فکری طاقت کا سہارا لیا ہے اس کام کا سبب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جھٹلانا، آپ پر بہتان باندھنا اور گناہوں کے ارتکاب پر جری اور بے باک ہو جانا ہے[4]۔

یہ طریقۂ کار یعنی معیار پیش کرنا ایک کامیاب طریقہ رہا ہے اس لئے کہ اس طرح غالیوں کے عقائد و نظریات کو سوال کے دائرے میں لاتے تھے نیز اس اقدام نے حدیث گڑھنے کے سلسلہ کو بھی روک دیا تھا۔

ان سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ طریقۂ کار سبب بنا کہ لوگ آئمہ علیہم السلام اور اصول عقائد کو پہچاننے میں کم سے کم مشکلات سے دچار ہوں۔ یہ وہی مقصد تھا کہ جسے امام جعفر صادق علیہ السلام عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا غلو اور غالیوں سے مقابلہ کا طریقہ ہمیں بتاتا ہے ہم اہل بیت علیہم السلام کی معرفت حاصل کرنے میں ہر طرح کے افراط و تفریط سے پرہیز کریں اور اعتدال و میانہ روی کا خیال رکھیں۔ نہ ان حضرات کو ان کے مقامات سے اوپر لے جائیں اور انھیں خدا کے مرتبہ تک پہنچادیں اور نہ ہی ان کے ان مقامات کا انکار کر دیں جنھیں قرآن و حدیث نے بیان کئے ہیں جیسا کہ امام علی علیہ السلام نے فرمایا ہے :

---

[1] بحار الانوار، ج ۲۵، ص ۲۸۷-۲۸۸

[2] بحار الانوار، ج ۲۵، ص ۲۸۷-۲۸۸

[3] میزان الاعتدال، ج ۳، ص ۲۹۷.

[4] حیات فکری و سیاسی امامان شیعہ، ص ۲۶۳.

هلك فی رجلان: محب غال و مبغض قال میرے سلسلہ میں دو طرح کے لوگ ہلاک ہوں گے: ایک غلو کرنے والا دوستدار، دوسرے میرے مقام و منزلت کو کم کرنے والا دشمن۔[1]

دیگر آئمہ معصومین علیہم السلام نے بھی کافی شدت سے غلو کا مقابلہ کیا ہے، علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے تقریباً ایک ہزار روایتیں اس بارے میں ذکر کی ہیں[2]۔

شیعہ علماء و فقہاء نے بھی غلو اور غالیوں کا جم کر مقابلہ کیا ہے اور غالیوں کی کھل کر مذمت اور سرزنش کی ہے۔ شیخ مفید علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: غالیوں کے بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ کافر ہیں اور یہود و نصاریٰ سے بدتر ہیں[3]۔

نہایت افسوس کے ساتھ یہ بات کہنی پڑ رہی ہے کہ اس دور میں بھی ہمارے سماج کی بڑی مصیبتوں اور آفتوں میں سے ایک غلو اور غلو کی جانب رجحان ہے جو مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے اگر اس کو نہ روکا گیا تو معارف اہل بیت علیہم السلام کو کافی نقصان پہنچ سکتا ہے اور لوگ حقیقی شیعوں کو پہچاننے میں طرح طرح کی مشکلوں کا شکار ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ غلو کا عام ہونا بہت سی اعتقادی اور سیاسی خرابیوں کو اپنے ساتھ لے کر آئے گا جو دین اور دینداری کے لئے بہت خطرناک ثابت ہوگا۔ رب کریم ہم سب کو اس آفت سے اپنی پناہ میں رکھے۔

---

[1] نہج البلاغۃ، کلمات قصار، ۱۱۷

[2] بحار الانوار، ج ۲۵، ص ۳۶۵

[3] الاعتقادات فی دین الامامۃ، ص ۷۱.

مدح امام جعفر صادق علیہ السلام

علامہ ذیشان حیدر جوادی

خلاق دو عالم کا ایسا شہ کار امام صادقؑ ہیں　　سرکار رسالت کا زندہ کردار امام صادقؑ ہیں

اسلام کے ہر منصب کیلئے اقرار امام صادقؑ ہیں

اور کفر کے ہر مذہب کیلئے انکار امام صادقؑ ہیں

قدرت نے عطا کی ہے ان کو پروازِ نظر کی وہ طاقت　　مذہب کی ہر اک خدمت کے لیئے تیار امام صادقؑ ہیں

گر دین خدا پر حملہ ہو بن جاتے ہیں یہ مذہب کی سپر

باطل جو اُٹھائے سر اپنا تلوار امام صادقؑ ہیں

سب اہل ستم ان سے بھاگے ٹھہرا نہ کوئی ان کے آگے　　فرار ہیں سارے اہل ستم کرّار امام صادقؑ ہیں

منصور کا ناصر کوئی نہیں اس رہ کا مسافر کوئی نہیں

اب قافلۂ حق کے تنہا سالار امام صادقؑ ہیں

جو دینِ خدا کا ہو جویا اس کے لئے ہیں قرآں گویا　　دشمن کے لئے اک فولادی دیوار امام صادقؑ ہیں

ایمان کی ہر حکمت اُن سے اسلام کی ہر وسعت اُن سے

ہے علم اگر اک نقطۂ با پر کار امام صادقؑ ہیں

جو امتِ حق میں شامل ہو جو جنتِ حق میں داخل ہو　　لازم ہے اُسے یہ یاد رہے سردار امام صادقؑ ہیں

مالک سے اگر تصدیق نہیں پھر کوئی بشر صدیق نہیں

اور دہر کی ہر سچائی کا معیار امام صادقؑ ہیں

***

کشتۂ اضطراب

مہدی باقر خان/نئی دہلی

کعبۂ دل، جناب تیرے ہیں　　سارے اعلیٰ خطاب تیرے ہیں

دل تو میرا ہے دھڑکنیں تیری

آنکھیں میری ہیں خواب تیرے ہیں

چاند تیری جبیں کا صدقہ ہے　　سب اجالوں کے قاب تیرے ہیں

پھول خوشبو ادھار لیں تجھ سے

گل و گلشن، گلاب تیرے ہیں

تجھ سا کوثر صفت ہمارے لئے　　ہم سے حال خراب تیرے ہیں

انبیاء اوصیاء و جن و ملک

ہیں سوالی، جواب تیرے ہیں

تو ہے فرزند کوثر و تسنیم　　سارے دریا حباب تیرے ہیں

قول مرسل ہو یا حدیث امام

سب میں لحن خطاب تیرے ہیں

ہے مقابل جہاں تو خوف نہیں　　کیونکہ ہم ہمرکاب تیرے ہیں

متن انجیل اور قرآں میں

سب فضیلت کے باب تیرے ہیں

کربلا کی زمین سے ایراں تک　　سب کے سب انقلاب تیرے ہیں

منتظر سب تمہارے جیتے جی

کشتۂ اضطراب تیرے ہیں

امام حسن عسکری علیہ السلام کی سیاسی اور اجتماعی سرگرمیاں

علی عباس حمیدی

امام حسن عسکری علیہ السلام شیعہ اثنا عشری مسلمانوں کے گیارہویں امام ہیں جو سن ۲۳۲ھ ق میں مدینہ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد کی طرح عباسی خلفاء کے جبر سے سامراء کے عسکر نامی محلہ میں سکونت پذیر ہوئے اسی وجہ سے عسکری کے نام سے مشہور ہوئے آپ کو ۲۲ سال کی عمر میں امامت ملی جسکی مدت چھ سال رہی اور آپؑ کی امامت کا پورا دور محلہ عسکر میں گذرا۔ آخر کار ۲۸ سال کی عمر میں معتمد عباسی کے ہاتھوں ۸ ربیع الاول سن ۲۶۰ ہجری میں شہید ہوئے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کی سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں کا اندازہ لگانے کے لئے ہمیں ان کے دور کے حالات کا مطالعہ کرنا ہوگا آپ کا دور بہت سخت اور حکومت کی مکمل نگرانی میں بسر ہوا شیعہ افراد اکثر آپؑ کے دیدار سے محروم رہتے تھے امام کے وکیل کھلے عام اگر آپؑ سے ملاقات بھی نہیں کر سکتے تھے چونکہ قدم قدم پر حکومت کے جاسوس بیٹھے رہتے تھے اس لئے امام عسکری علیہ السلام کے وکلاء کبھی تیل بیچنے والے، کبھی سبزی بیچنے والے تو کبھی کسی اور کاروباری افراد کا حلیہ اختیار کر کے یا مختلف طریقوں سے محلے میں آمد و رفت کیا کرتے تھے جیسا کہ عثمان بن سعید تیل بیچنے کے بہانے سرگرمی کیا کرتے اور امامؑ کے شیعہ، رقومات شرعی ان کے ذریعہ امامؑ تک پہنچاتے تھے۔ اور امام شیعوں کی ضرورتوں اور مشکلات کے مطابق انہیں معتمد افراد کے ذریعے اپنے فرامین اور احکام اپنے شیعوں کو پہنچا دیا کرتے تھے۔ شیعوں کے کچھ لوگ خفیہ طور پر محلے کی نگرانی کرنے والے فوجی دستوں میں نفوذ کر چکے تھے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کی منجملہ سیاسی سرگرمیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ آپؑ نے شدید دباؤ اور سختیوں کے باوجود اپنے چاہنے والوں کو سیاسی تقویت پہنچائی کیونکہ شیعوں کے بڑی بڑی شخصیات سیاسی دباؤ کا شکار تھیں لہذا امام علیہ السلام انہیں صبر و تحمل کی تلقین کرتے ہوئے سیاسی اور اجتماعی ذمہ داریوں کی جانب متوجہ کیا کرتے تھے۔ آپؑ نے علی بن حسین بن بابویہ کو ایک خط میں لکھا: ہمارے شیعہ میرے بیٹے کے ظہور تک مسلسل غم و اندوہ کا شکار رہیں گے میرا بیٹا وہ ہے جس کے بارے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بشارت دی کہ وہ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھری ہے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کا زمانہ عباسی دور حکومت کا بدترین دور شمار ہوتا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ حکام زمانہ کی عیش و عشرت کی وجہ سے بہت سی اسلامی اقدار کا خاتمہ ہو چکا تھا لہذا اگر امام علیہ السلام کی مسلسل جد و جہد نہ ہوتی تو عباسی حکومت کی سیاست کی وجہ سے اسلام کا خاتمہ ہو جاتا اگرچہ امام علیہ السلام پر عباسی حکومت کا مکمل پہرہ تھا لیکن اس کے باوجود بہت سے اسلامی مقامات پر آپؑ کے اپنے نمائندے پائے جاتے تھے اور اس کے نتیجہ میں آپؑ مسلمانوں کے حالات سے باخبر رہتے تھے بہت سے شہروں میں مساجد اور دینی مراکز آپؑ کے حکم سے تعمیر کئے گئے، منجملہ شہر قم میں مسجد امام حسن عسکریؑ کی تعمیر سیاسی نقطہ نظر سے شیعوں کو ایک مرکز فراہم کر کے انہیں ایک دوسرے کے قریب لانا تھا۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ اپنی امامت اور اپنے نمائندوں کے ذریعہ لوگوں کی تمام قسم کی مشکلات اور کمیوں کو

دور کرنے کے درپے تھے۔ آپؑ کے دور میں سیاسی دباؤ کی دو وجہیں تھیں ایک وجہ عراق میں شیعوں کے لئے حالات سازگار ہو رہے تھے اور وہ عباسی خلفاء کی حکومت کو جائز نہیں سمجھتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ امامت، حضرت امام علی علیہ السلام کے بیٹوں میں باقی ہے اور دوسری جانب سے اس زمانہ میں صرف امام عسکریؑ ہی اس خاندان کی ممتاز شخصیت تھے، عباسی حکومت کو معلوم تھا کہ امام مہدی عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف امام حسن عسکری علیہ السلام کی نسل سے ہوں گے لہذا ان کی کوشش تھی آپؑ کے بیٹے کو قتل کر دیں یا دنیا ہی میں نہ آنے دیں۔

شیعوں پر بھی سیاسی و سماجی لحاظ سے سختیاں تھیں اور انکی کڑی نگرانی ہوتی تھی حتی کہ قید خانے میں بھی علیحدہ سے امام عسکری اور ان کے شیعوں پر جاسوسوں کو رکھا گیا تھا تاکہ ہر نقل و حرکت پر نظر رکھی جا سکے۔[1]

مگر اس دباؤ اور سختی کے باوجود شیعہ اتحاد ماضی کے مقابلے زیادہ قوی ہوتا گیا۔ تاہم حکومت کی جانب سے امام حسن عسکری علیہ السلام پر نگرانی کا یہ عالم تھا کہ آپ کو مأمور کیا جاتا کہ ہفتہ میں دو بار دار الخلافہ میں حاضری دیں۔[2]

ایسے سخت حالات میں بھی امام علیہ السلام نے اپنے چاہنے والوں کی ہدایت کے لئے بہت راز داری اور حکمت عملی سے کام کیا جس کے سبب شیعوں کی تعداد میں قابل ملاحظہ اضافہ ہوا اور شیعہ دور دراز کے علاقوں تک پہنچ گئے امام علیہ السلام نے دور دراز کے علاقوں میں بود و باش اختیار کرنے والے شیعوں کو بھی تنہا نہیں چھوڑا بلکہ انکے مسائل کے حل کے لئے اپنے وکیلوں کو روانہ کیا جو ہر جگہ کے شیعوں کے مسائل سے آگاہ ہوتے اور ان کے مسائل کو حل کرتے تھے۔[3]

ایران میں خراسان، جبال اور گرگان سے لیکر قم، اہواز تک کے علاقوں کا نام اس حوالے سے لیا جا سکتا ہے کہ جہاں امام علیہ السلام کی جانب سے وکیلوں کا ایک سلسلہ قائم تھا جو ان علاقوں کے حالات سے امام علیہ السلام کو باخبر کرتے اور امام علیہ السلام انہیں شیعوں کی رہبری کے سلسلہ میں ضروری ہدایات فرماتے تھے۔[4]

آپ نے ایک طرف تو فکری و سماجی طور پر شیعوں کو مضبوط کیا دوسری طرف مالی مسائل میں بھی انہیں تنہا نہیں چھوڑا اور جہاں ضرورت پڑی وہاں آپ نے شیعوں کی مالی مدد فرمائی اور ان مشکلات کے حل کے ساتھ ساتھ حکومت کی جانب سے ہونے والے ظلم کو ناچیز سمجھنے کی دعوت دی اور اپنے وکیلوں کے ذریعہ شیعوں کے درمیان یہ بات راسخ کرا دی کہ ظلم آج ہے کل نہیں رہے گا اور ظلم کا شکار ہو کر ہمت نہ ہارو اسے ناچیز سمجھ کر کل کے سرمایہ کی طرف بڑھو اور برے اور سخت حالات میں خدا پر بھروسہ کرو۔[5]

---

۱ طبرسی، اعلام الوری، ص ۳۵۴۔

۲ طوسی، الغیبۃ، ص ۱۳۹۔

۳ سید بن طاووس، مہج الدعوات، ص ۶۳۔

۴ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب، ج ۴، ص ۴۲۵؛ اربلی، کشف الغمۃ، ج ۲، ص ۴۲۵ و ۴۲۷؛ صدوق، کمال الدین و تمام النعمۃ، ص ۴۲۷۔

۵ طوسی، الغیبۃ، ص ۳۵۷۔

عباسی حکومت میں قیام و انقلاب کی بہت سی کوششیں بھی ہوئیں، ۲۱۹ ہجری سے ۲۷۰ ہجری تک ۱۸ قیام کئے گئے جو کچھ خامیوں کے باعث عباسی حکومت کے ذریعہ کچل دیئے گئے[۱]

امام حسن عسکری علیہ السلام اپنے شیعوں میں شعور کی روح پھونکنا چاہتے تھے امام کو ان سے بڑی توقع یہ تھی کہ وہ کوئی بھی کام انجام دینے سے پہلے اس کے نتائج اور انجام پر اچھی طرح سے غور و فکر کر لیا کریں تاکہ تدبر کے اس عمل سے اطمئنان و سکون حاصل ہو جائے اور عمل کا نقص دور ہو جائے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام نے فرمایا: "عَلیکُم بِالفِکرِ فَاِنَّهُ حَیاۃ قَلب البَصیر وَ مَفاتیحُ اَبوابِ الحِکمَۃِ" ہر عمل کے متعلق آپ لوگوں پر فکر و تامل کرنا واجب و ضروری ہے! بے شک فکر و تامل کرنا قلب بصیر کی زندگی اور حکمت کے دروازوں کی کنجی ہے۔

اسی تدبر و تعقل کا نتیجہ تھا کہ امام حسن عسکری علیہ السلام کے دور میں شیعہ مسلک مختلف علاقوں میں پھیل چکا تھا چنانچہ کوفہ، بغداد، نیشاپور، قم، آبہ (آوہ)، مدائن، خراسان، یمن، ری، آذربایجان، سامرا، جرجان و بصرہ وغیرہ میں شیعوں کی خاصی آبادی تھی ان شہروں کے درمیان سامرا، کوفہ، بغداد، قم و نیشاپور تو خاص اہمیت والے علاقے قرار پائے۔[۲]

امام کا رابطہ اپنے چاہنے والوں سے خطوط کے ذریعہ برقرار ہو پاتا تھا آپ انہیں اپنے خطوط اور نوشتہ جات سے ہدایت فرماتے اور سیاسی و سماجی فرائض کی ادائگی کے اصول و ضوابط تحریر فرما کر مزید عمل کی روح پھونک دیا کرتے تھے چنانچہ آپ اسحاق بن اسماعیل کو لکھے جانے والے خط میں واضح طور پر لکھتے ہیں: کہ اس شہر کے شیعہ جو کچھ اس خط میں لکھا جا رہا ہے اسی کے مطابق کرنے کے ذمہ دار ہیں۔[۳]

امام حسن عسکری علیہ السلام کی سیاسی، سماجی اور الٰہی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری اپنے بعد آنے والے آخری امام کا تعارف کرانا تھا دوسری طرف حکام بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے۔

ان کی کوشش تھی کہ آخری امام کا تعارف نہ ہونے پائے اسی لئے معتمد نے اپنے پانچ معتبر اور موثق نوکروں کو امام کے بیت الشرف سے خبریں لانے کے لئے معین کر دیا اس کے علاوہ اس نے صبح و شام آپؑ پر نظر رکھنے کے لئے حکیموں کی ایک جماعت معین کی اور ان سے یہ عہد لیا کہ وہ بالکل امام کے بیت الشرف سے جدا نہ ہوں۔ اور یہ سب امام کے مصلح اعظم فرزند کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے تھا جس کی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ سلم نے بشارت دی تھی۔

معتمد پچیس سال کی عمر میں خلیفہ بنا جو کہ اپنے ماں باپ کا نافرمان بیٹا اور لہو لعب کا دلدادہ تھا۔ اس نے رعایا کے امور انجام دینے سے چشم پوشی کر لی تھی اسی وجہ سے قبیلے اس کو بری نظر سے دیکھنے لگے تھے۔

---

۱ طوسی، الغیبۃ، ص ۳۵۷۔

۲ اَعلام الدین فی صفات المؤمنین، ج ۱، ص ۲۹۷۔

۳ حیاۃ الامام العسکری، محمد جواد طبسی، قم، دفتر تبلیغات، ص ۲۲۳؛ تاریخ الشیعۃ شیخ محمد حسین مظفر، مکتبۃ بصیرتی، ص ۶۲، ۷۸ و ۱۰۲؛ سیرہ پیشوایان، ص ۶۳۲۔

۴ معادن الحکمۃ فی مکاتب الائمۃ، فیض کاشانی، ص ۲۶۴۔

اس کے عہد حکومت میں امام حسن عسکریؑ کو بہت سی تکلیفوں، مشقتوں اور سختیوں کا سامنا کرنا پڑا، اُس نے امام کو نظر بند کرنے کا حکم دے دیا اور داروغۂ زندان سے کہا کہ وہ امام کے متعلق تمام اخبار و واقعات اور ان کی گفتگو کی تمام جزیات اُن تک پہنچایا کرے، داروغہ زندان نے معتمد کو خبر دی کہ امامؑ نے عباسی سیاست کے خلاف کوئی بھی عمل انجام نہیں دیا، انھوں نے تو دنیا کو خیرباد کہہ دیا ہے، وہ دن میں روزہ رکھتے ہیں اور رات عبادت میں بسر کرتے ہیں، معتمد نے دوسری مرتبہ پھر داروغہ زندان سے آپؑ کے سلسلہ میں معلومات حاصل کیں تو اُس نے پہلے کی طرح خبر دی، جس کے نتیجہ میں معتمد نے آپؑ کو قید سے آزاد کرنے کا حکم دیدیا، داروغہ زندان آپؑ کو قید سے آزاد ہونے کی خبر دینے کیلئے جلدی سے پہنچا تو اس نے دیکھا کہ آپؑ وہاں سے نکلنے کے لئے اپنا لباس اور نعلین وغیرہ پہن کر آمادہ ہو گئے ہیں، داروغہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اس نے آپؑ کی خدمت میں معتمد کا خط پیش کیا، قید خانہ میں آپؑ کے ہمراہ آپؑ کا جعفر نام کا بھائی تھا۔

لیکن آپؑ اس وقت تک قید خانہ سے باہر نہیں آئے جب تک آپؑ نے اپنے بھائی جعفر کو قید خانہ سے آزاد نہیں کرالیا۔

الغرض امام حسن عسکری علیہ السلام کی سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ:

آپ مختلف علاقوں کے شیعوں کے درمیان نمایندوں اور قاصدوں کے ذریعہ ارتباط قائم کیا کرتے تھے۔

عباسی حکومت کی تمام تر نگرانی اور جاسوسیوں کے باوجود پوشیدہ سیاسی کارکردگیوں کو جاری رکھے ہوئے تھے۔

آپ شیعوں کی مسلسل مالی حمایت اور مدد فرمایا کرتے تھے۔

آپ شیعوں کے اہم سیاسی افراد اور علماء کی تقویت فرمایا کرتے اور مشکلات کے مقابل ان کے لئے راہ حل فراہم فرماتے۔

آپ تمام تر نظر بندیوں کے باوجود اپنے بیٹے بارہویں امام کی غیبت کے لئے شیعوں کو آمادہ کیا کرتے۔

نوحہ در حال امام حسن عسکری علیہ السلام

صابر علی عمرانی

ہے سامرہ میں آج حسن عسکریؑ کا غم یعنی کہ یہ ہے وارث علم نبی کا غم

مارا ہے معتمد نے امام غریب کو

کس طرح بیکسی نے کیا بے کسی کا غم

نظروں سے دور رکھا تھا شیعوں کی آپ کو ان کو ستا رہا ہے یہ بے چارگی کا غم

شامل ہے خود جنازہ میں قاتل بھی آپؑ کے

ظلمت بھی کر رہی ہے کسی روشنی کا غم

کعبہ لرز رہا ہے تو عرفات ہے اداس مکہ مدینہ کرتا ہے حق کے ولی کا غم

ظالم نے فاطمہؑ پہ بھی کھایا نہ رحم کچھ

کیونکر نہ ہو جہاں میں نبی کے وصی کا غم

پرسہ امام عصر کو دو ان کے باپ کا شیعو! مناؤ آج یہ ابن نقیؑ کا غم

بابا کو ظالموں نے کیا زہر سے شہید

اور رہ گیا تمہارے لئے زندگی کا غم

وہ کامیاب ہو گا سر حشر دیکھنا صابر منایا جس نے بھی حق کے ولی کا غم

حضرت معصومہ قم سلام اللہ علیہا کے ایران تشریف لانے کی وجوہات

ظہور مہدی مولائی

ماہ ذوالقعدۃ الحرام ۱۷۳ ہجری کی پہلی بابرکت تاریخ تھی کہ جب ایک پاک و پاکیزہ بی بی نے مرکز دین و دیانت، کاشانہ علم و معرفت اور خانہ امامت و ولایت میں آنکھیں کھولیں اور اپنے پدر بزرگوار حضرت امام موسی کاظم علیہ الصلوۃ والسلام اور مادر گرامی نجمہ خاتون علیہا السلام کی آنکھوں کو راحت و مسرت کی ٹھنڈک بخشی۔

اس مبارک بی بی کا اسم گرامی " فاطمہ " رکھا گیا، چونکہ اس نام سے انہیں ان کی ولادت سے بہت پہلے ان کے جد بزرگوار حضرت امام جعفر صادق علیہ الصلوۃ والسلام موسوم فرما چکے تھے۔

جس کا ثبوت حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول اس روایت سے بخوبی ملتا ہے: انَّ لِلّٰهِ حَرَما وَ هُوَ مَكَّةُ، وَ لِرَسُولِهِ حَرَما وَ هُوَ الْمَدِينَةُ، وَ لِامِيرِ الْمُؤمِنِينَ حَرَما وَ هُوَ الكُوفَةُ، وَ لَنا حَرَما وَ هُوَ قُم، وَ سَتُدْفَنُ فِيها امْرَأَةٌ مِنْ وُلْدِي تُسَمّى فاطِمَةُ، مَنْ زارَها وَجَبَتْ لَهُ الجَنَّةُ (قَالَ عليه السلام ذلِكَ وَلَمْ تُحْمَلْ بِمُوسى أُمَّهُ)۔[1]

بلاشبہ اللہ کا ایک حرم ہے اور وہ مکہ ہے، اس کے رسول کا ایک حرم ہے اور وہ مدینہ ہے، امیر المومنین کا ایک حرم وہ ہے اور وہ کوفہ ہے اور ہم سب کا ایک حرم ہے اور وہ قم ہے، عنقریب وہاں میری اولاد سے ایک خاتون دفن ہوگی، جس کا نام فاطمہ ہوگا، جو اس کی زیارت کرے گا، اس پر جنت واجب ہو جائے گی۔ واضح رہے کہ یہ حدیث مولا نے اس وقت ارشاد فرمائی تھی، جب بی بی معصومہ قم کے والد مکرم حضرت امام کاظم علیہ السلام بھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔

چونکہ اس بی بی کو خداوند متعال نے اپنی مشیت اور لطف و کرم سے نہایت مبارک گھر میں پیدا کیا تھا، اس لئے انہوں نے اس عظیم نعمت کی قدر دانی و شکر گزاری کرتے ہوئے اپنے نفس و قلب کو علم و معرفت، دین و ایمان اور اعلی اخلاق و کردار سے اس طرح آراستہ کیا کہ آپ کو طاہرہ، تقیہ، رضیہ، مرضیہ، نقیہ، حمیدہ، رشیدہ، سیدہ، اُختِ الرضا اور مُحدّثہ جیسے باعظمت القاب سے یاد کیا جانے لگا۔[2]

بلاشبہ آپ کے اس بلندیٔ ایمان و کردار پر فائز ہونے کے دو حسب ذیل سبب تھے:

۱۔ براہ راست حضرت امام موسی کاظم علیہ الصلوۃ والسلام کی اعلی تربیت و نظارت کا آپ کو حاصل ہونا۔

۲۔ آپ کا اپنے امام وقت اور معصوم پدر بزرگوار اور برادر مُکرّم حضرت امام رضا علیہما الصلوۃ والسلام کے فیوض و برکات سے بھرپور استفادہ کرنا۔

---

[1] ۔ مجلسی، بحار الانوار، ج ۶۰، ص ۲۶۱۔

[2] ۔ لقمانی، یاس یاسین، ص ۳۵۔

افسوس کہ آپ نے اپنے بابا کے ہدایت و سعادت افروز سائے میں اپنی زندگی کی فقط چھ یا سات بہاریں ہی طے کی تھیں کہ حاکم جور ہارون الرشید ملعون نے انہیں مدینہ سے جلاوطن کر کے آپ کو ان کے مبارک سایہ عاطفت و رحمت سے محروم کر دیا۔

البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس جانکاہ حادثہ کے بعد آپ کو قدرے سکون اس لئے حاصل رہا کہ سرپرستی کے طور پر آپ کے برادر عالیمقام سرکار امام علی رضا علیہ الصلوۃ والسلام موجود تھے. لیکن جب مامون ملعون نے یہ عظیم سہارا بھی آپ اور آپ کے اہل خانہ و اقارب سے چھین لیا تو آپ پر مصیبتوں کا کوہ گراں گر پڑا۔

تاریخی بیان کے مطابق ۲۵ ذوالقعدۃ الحرام ۲۰۰ ہجری قمری کو حاکم جائر مامون ملعون نے حضرت امام رضا علیہ الصلوۃ والسلام کو مدینہ چھوڑنے اور "مرو" ایران کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کیا اور اس کے شدید اصرار پر مولا علیہ السلام کو اس کی ولی عہدی کا منصب بھی ظاہراً قبول کرنا پڑا[۲]. آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ سے ہجرت کرنے کے بعد بنی عباس کے جبر و تشدد کی وجہ سے بنی ہاشم (کہ جن میں زیادہ تر تعداد موسوی سادات کی تھی) پر زندگی بہت سخت ہو گئی تھی۔ بالخصوص بی بی معصومہ علیہا السلام کے لئے اپنے وقت کے امام اور برادر بزرگوار کی یہ ہجرت و فرقت انتہائی دردناک تھی، جسے آپ ایک سال سے زیادہ برداشت نہ کر سکیں اور ۲۰۱ ہجری قمری کو مدینہ منورہ سے خراسان کے لئے عازم سفر ہو گئیں۔

یہ سفر بظاہر تو آپ نے اپنے برادر بزرگوار حضرت امام رضا علیہ الصلوۃ والسلام کے دیدار مبارک کے لئے فرمایا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنے عزیز بھائی اور وقت کے امام کی زیارت و قربت کے قالب میں اس سفر کے دوسرے اہداف و مقاصد بھی آپ کے مد نظر تھے۔ شاید اسی لئے جب آپ نے اس سفر کا آغاز کیا تو آپ تنہا مدینہ سے نہیں نکلیں بلکہ موسوی سادات کی اہم اور موثر شخصیات کو اپنے ساتھ لے کر چلیں۔ آپ کا یہ تبلیغی و احتجاجی قافلہ آپ کے بھائیوں فضل، جعفر، ہادی، زید، قاسم، چند بھتیجوں، کچھ غلاموں اور کنیزوں پر مشتمل تھا[۳]۔ اور بعض کتابوں میں اس قافلہ میں شامل آپ کی چند بہنوں میمونہ، فاطمہ صغریٰ اور خدیجہ کا بھی ذکر ملتا ہے اور افراد قافلہ کل تعداد ۴۰۰ بتائی گئی ہے۔[۴]

دوسری اہم بات یہ ہے کہ آپ کا یہ قافلہ اسلام ناب (تشیع) کی تبلیغ و ترویج اور حکومت جائر و ظالم کے ظلم و استبداد پر احتجاج کرنے کے لئے مدینہ منورہ سے چل کر بہت سے اہم شہروں اور دیہاتوں سے گزرا ہے اور ظاہر ہے کہ ان اہم شہروں اور دیہاتوں کا انتخاب حضرت معصومہ اور آپ کے بھائیوں اور بھتیجوں نے مذکورہ اہم اہداف ہی کے لئے کیا تھا۔

محققین نے حضرت معصومہ سلام اللہ علیہا کے اس سفر کی متعدد وجوہات بیان کی ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ اپنے برادر بزرگوار حضرت امام رضا علیہ السلام کی زیارت کا اشتیاق شدید۔

---

[۱] اربلی، کشف الغمہ، ج ۲ ص ۸۲۳۔

[۲] فتال نیشاپوری، روضۃ الواعظین، ص ۲۲۵۔

[۳] زینبی، تاریخ زندگانی امام کاظم علیہ السلام، ص ۲۴۔

[۴] عاملی مرتضیٰ، الحیاۃ السیاسی للامام الرضا علیہ السلام، ص ۴۲۸۔

چونکہ اپنے والد مکرم حضرت امام موسی کاظم علیہ الصلوۃ والسلام کی غریبانہ و مظلومانہ شہادت کے بعد بی بی پورے طور پر اپنے عزیز بھائی اور امام مفترض الطاعت امام سرکار امام رضا علیہ الصلوۃ والسلام سے وابستہ ہوگئی تھیں اور اس وقت انہیں کی ذات مبارک آپ کی سرپرست اور پناہ گاہ تھی اور وہی آپ کی قلبی و دلی اور دینی و ایمانی محبت و عقیدت نیز دینی و علمی فیوض و برکات کے حصول کا مرکز تھے، اس لئے ان کی فرقت آپ کے لئے قابل تحمل نہیں تھی، بنابراین آپ کو یہ سفر کرنا پڑا۔[1]

۲۔ مامون الرشید کی خلافت و حکومت میں سرکار امام رضا علیہ الصلوۃ والسلام کا اہم اور عظیم مقام و مرتبہ اس بات کی وجہ بنا کہ دین برحق اور تشیع کی ترویج و تبلیغ کے لئے سادات، اولاد آئمہ اور آگاہ شیعہ ہر طرف سے ایران کی سمت ہجرت کریں اور الحمد للہ انہوں نے بڑے پیمانے پر یہ ہجرت انجام دی، جس کا زندہ ثبوت تاریخی کتابوں کے علاوہ ایران میں پائے جانے ان کے کثیر و عظیم مزارات کی شکل میں باقاعدہ موجود ہے۔

۳۔ بعض محققین یہ بھی کہتے ہیں کہ سرکار امام رضا علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے ایک خط کے ذریعہ حضرت معصومہ سلام اللہ علیہا کو ایران آنے کی دعوت دی تھی۔

چانچہ محقق علی اکبر مہدی پور نے اس خط کی سند کتاب "من لایحضرہ الفقیہ" کو قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ: حضرت امام رضا علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے غلام و خادم کو ایک خط دے کر مدینہ بھیجا جس میں جناب معصومہ سلام اللہ علیہا کو خراسان آنے کا دستور دیا گیا تھا، پس آپؑ یہ دستور پاتے ہی ایران کی طرف عازم سفر ہوگئیں۔[2]

۴۔ حضرت معصومہ سلام اللہ علیہا نے یہ سفر ان اہم اور حساس آبادیوں سے طے فرمایا، جن آبادیوں سے مامونی ظالم حکومت نے سرکار امام رضا علیہ الصلوۃ والسلام کو گزرنے سے منع کیا تھا، چونکہ وہ آبادیاں شیعہ نشین تھیں۔

بی بی نے اپنی دینی و ایمانی بصیرت و فراست سے اس اہم مسافرت میں ان آبادیوں کو شامل فرمایا۔[3] تاکہ اس عصر و وقت کے امام کی غربت و مظلومیت کو بیان کر کے موجودہ ظالم و جابر اور مکار و عیار حکومت کی نقاب کشائی کر سکیں اور اسلام ناب یعنی تشیع کے قالب میں تازہ روح پھونک سکیں، اس جہت سے یہ باعظمت سفر احتجاجی بھی تھا اور تبلیغی و ترویجی بھی۔

اہم نکتہ: اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت معصومہ قم سلام اللہ علیہا کا یہ عظیم سفر بلاشبہ متعدد دینی و سیاسی اور تبلیغی و احتجاجی اہداف اور علل و وجوہات کا حامل تھا، اسی لئے مامونی حکومت سے برداشت نہیں ہوسکا اور بی بی معصومہ قم علیہا السلام کے اس عظیم قافلہ پر ساوہ میں بہیمانہ حملہ کرا دیا گیا، جس کی وجہ سے آپ کے بہت سے بھائیوں اور بھتیجوں کی شہادت واقع ہوئی اور آپ کو عالم غربت و مسافرت میں جانکاہ صدمہ سے دوچار ہونا پڑا اور وہاں آپ کو مسموم بھی کر دیا گیا۔[4]

---

[1] ۔ میر عظیمی، بارگاہ فاطمہ معصومہ، ص ۲۴۔

[2] ۔ مہدی پور، علی اکبر، کریمہ اہل بیت، ص ۴۹۳۔

[3] ۔ پاک، محمد رضا، قم در دو قرن نخست ہجری، فصلنامہ تخصصی تاریخ اسلام، تابستان، ۸۲، مؤسسہ باقر العلوم، شمارہ ۱۴، ص ۳۵۔

[4] محمدی، اشتہاردی، محمد؛ حضرت معصومہ فاطمہ دوم، قم، انتشارات علامہ، ۱۳۷۵، ص ۱۱۸۔

قرآنِ مجید سے غفلت
مسلمانوں کے تنزل و زوال کا باعث

سید تقی عباس رضوی کلکتوی

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَ یُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِیْرًا[1]

"بیشک قرآن اس راستہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور ان صاحبانِ ایمان کو بشارت دیتا ہے جو نیک اعمال بجالاتے ہیں کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔"

اہلِ مغرب کی تصانیف پہ دم دیتے ہیں اور "قرآن" ہے لپٹا ہوا جزدانوں میں!

صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ سارے عالم کے انسانوں کیلئے قرآن مجید سرچشمہ ہدایت اور مینارہ نور ہے۔ یہ وہ کلام الٰہی ہے جس میں غیر واقعی بات، نہ اس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور نہ اس کے پیچھے کی طرف سے، یہ وہ کتاب الٰہی ہے جسے خداوند عالم نے قیامت تک آنے والے انسانوں کی رشد و ہدایت اور فلاح و کامیابی کے لئے نازل فرمایا ہے، یہ وہ آفاقی کلام ہے جو دنیائے انسانیت کو اخلاقی پستیوں اور توہمات کی زنجیروں سے نجات دلانے کا عظیم مقصد لے کر آیا ہے۔ یہ وہ بابرکت کتاب الٰہی ہے جسے محبت و عظمت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اجر و پاداش، جس کی تلاوت کی جائے تو عبادت، جسے سنا جائے تو ثواب، جس کے دستور حیات پر غور و فکر اور عمل کیا جائے تو دین و دنیا کی سعادت و کامرانی کا ذریعہ ہے اور یہ ایمان والوں کے لئے سراسر خیر و برکت، فوز و فلاح اور رشد و ہدایت، شفا و رحمت اور سراپا ہادی و بشارت دینے والا ہے۔ جیسا کہ سورہ مبارکہ اسراء میں ارشاد خداوندی ہے کہ: بیشک قرآن اس راستہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور ان صاحبانِ ایمان کو بشارت دیتا ہے جو نیک اعمال بجالاتے ہیں کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔" نیز ارشاد ہے: هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ، یہ ہدایت ہے متقین کیلئے، متقین ہی اس سے ہدایت حاصل کر سکتے ہیں۔ البتہ "هُدًى لِّلنَّاس" بھی ہے یعنی اللہ کی یہ کتاب ساری کائناتِ انسانی کی ہدایت کے لئے ایک مثالی دستور حیات ہے مگر! یہ عام ہے لیکن خاص ہدایت صرف اور صرف صاحبان ایمان کے لئے ہے: "هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ۔" یعنی یہ تمام لوگوں کے لئے ہدایت و رہنمائی ہے اور پرہیز گاروں کے لئے ہدایت و نصیحت یعنی جو لوگ اس پر ٹھوس ایمان رکھتے ہیں، اس کی تلاوت کرتے ہیں، اس کے احکام و تعلیمات اور اس کے اوامر و نواہی پر کماحقہ عمل پیرا ہیں اس کے حلال کو حلال سمجھتے اور اس کے حرام کو حرام سمجھتے ہیں، اور اس پر بغیر کسی رکاوٹ کے عمل کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کے لئے یہ سراپا ہدایت ہی ہدایت ہے اس کا پڑھنا بھی ہدایت، اس کا سننا بھی ہدایت، اس کا پھیلانا بھی ہدایت اس کی تعلیم و تعلم بھی ہدایت گویا اس کا ہر ہر لفظ اور اس کی ساری چیزیں ہدایت ہی ہدایت ہیں۔۔۔ جیسا کہ روایت میں

---

[1] سورہ مبارکہ اسراء آیت/۸

ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **اللہ تعالیٰ کی کتاب سراپا ہدایت و نور ہے**، اس پر عمل کرو اور اسے مضبوطی سے تھام لو یہ اللہ کی رسی ہے۔ جو اس کی اتباع کرے گا وہ ہدایت یافتہ ہوگا اور جو اس کو ترک کر دے گا وہ گمراہی پر ہوگا۔ **هُوَ حَبْلُ اللهِ، مَنِ اتَّبَعَهُ كَانَ عَلَى الْهُدَى. وَمَنْ تَرَكَهُ كَانَ عَلَى ضَلَالَةٍ.**

اس روئے زمین پر اگر خالق سے مخلوق کو جوڑنے کا اگر کوئی وسیلہ ہے تو یہی قرآن مجید ہے جو ہمارے اور اللہ کے درمیان ایک عہد و میثاق کی صورت میں موجود ہے جسے مضبوطی سے تھام لینے کی تاکید کی گئی ہے کہ " **وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللهِ...** " و " **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا...** "، جس کی وضاحت پیغمبر اکرم ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے ہوتی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: " **كِتَابُ اللهِ هُوَ حَبْلُ اللهِ الْمَمْدُوْدِ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْأَرْضِ** " اللہ کی کتاب ہی اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک خدا اور اس کے بندوں کے درمیان تنی ہوئی ہے۔ گویا یہی وہ چیز ہے جو بندوں کو خدا سے جوڑتی ہے۔ جس نے اسے تھام لیا، گویا خدا کو تھام لیا اور جس نے اسے چھوڑ دیا گمراہی اور ہلاکت اس کا مقدر بن گیا۔۔۔

یہ کہنا حق بجانب ہے کہ آج امت مسلمہ جس درد و الم، رنج و غم، مصائب و آلام، ذلت و پستی، تنزل و زوال اور جس ناگفتہ بہ حالات کا شکار ہے وہ اس کے اعمال ہی کا خمیازہ ہے! جس بابرکت کتاب سے مسلمانانِ عالم کو تعلق استوار کرنے اور اسے مضبوطی سے تھام لینے کی تاکید کی گئی تھی وہ اسے چھوڑ کر دنیوی کامیابی حاصل کرنے کی کوشش میں اپنی سرگردانی اور اپنے اسلام کا جو نمونہ اِس وقت دنیا میں پیش کر رہے ہیں اس کا نتیجہ بجز " **خَسِرَ الدُّنْيَا وَالآخِرَةَ ذَلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ** " کے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اسی تصویری خاکہ کے پیش نظر عالمی اور ملکی منظر نامے پر اسلام، قرآن اور مسلمانوں سے متعلق جو حالات پیش ہیں وہ نہایت ہی افسوس ناک اور قابل غور ہے!

خدا کی عطا کردہ خاص عظمتوں، رفعتوں، نعمتوں، صلاحیتوں اور اور وسائل، مال و دولت سے سرشار زمین و آسمان کو مسخر کرنے والی اس قوم کے حالات اب یہ ہیں کہ ان پر ہر طرف سے دشمن حملہ آور ہے اور یہ اسلام دشمن طاقتوں کی یورش و یلغار کے مقابل پسپا ہوتے نظر آرہے ہیں اور اس کا سبب بس اتنا ہے کہ یہ اپنے مرکز و محور سے بھٹک چکی ہے۔ فرقہ واریت، مسلکی تعصب، فکری انتشار، بد عملی اور قرآن سے دوری نے اسے تباہ و برباد کر دیا اور اس پر زمینیں تنگ کر دی ہیں۔۔۔ آج! اپنے ملک میں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں جہاں جہاں مسلمان بستے ہیں وہاں ان کے خلاف منصوبہ بند سازشوں کے تحت ان کا استحصال ہو رہا ہے اور ان کا خون بہانا جائز سمجھا جانے لگا ہے اور اس بات سے ہر صاحبان فہم و ذکا اچھی طرح واقف ہیں کہ " کمیونسٹ روس " کے زوال کے بعد ۱۹۹۰ کی دہائی کے اوائل سے اور خاص طور پر امریکہ پر ۱۱/۹ کے حملے کے بعد امن عالم اور احترام انسانیت کے حامی قرآن و اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اسلام مخالف قوتوں کی مشق ستم اور ہر زہ سرائی کا جو بھیانک طوفان اٹھا وہ عالم اسلام کے لئے نہایت ہی رنج و غم، خوف ہراس اور کڑھن کی داستان بن گئی اور اس کے رد عمل میں جو نتیجہ سامنے آیا اسے دہشت گردی کا نام دے کر عالم اسلام اور مسلمانوں کو نشانہ بناتے ہوئے ان پر نت نئے طریقوں سے مختلف افکار و نظریات؛ کہیں آزادئ نسواں کا جھوٹا نعرہ، کہیں سکولرزم کا کھلا مکر و فریب، کہیں شوشلزم و کیمونزم کی خفیہ دعوت تو کہیں طالبان، القاعدہ، داعش اور ان جیسے دیگر تکفیری افکار و احزاب، لَو جہاد، لَینڈ جہاد جیسی چیزوں کو ان پر مسلط کر مسلم آبادی کی مذہبی، سماجی

شناخت، ان کی عبادت گاہوں، مدرسوں اور دیگر وسائل و اموال کو نشانہ بنایا گیا انہیں مارا، پیٹا جانے لگا، انہیں دربدر کیا جانے لگا، ان کے گھروں اور مکانوں کو زمیں بوس کیا جانے لگا، ان کے اختیارات کو چھینا جانے لگا ان کی ناموس کی بے حرمتی کی جانے لگی اور آئے دن ان کے خلاف سازشیں رچ کر انہیں پریشان کرنے کی حماقت کی جارہی ہے اور ان تمام واقعات و واردات کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرایا جاتا ہے! حالانکہ قرآن مجید نے کبھی کسی کو بھی مذہب، تہذیب، نسل یا کسی بھی علاقے کے رہنے والوں کو آپس میں لڑنے بھڑنے کی اجازت ہرگز نہیں دی ہے اور نہ ہی کبھی دہشت گردی، فساد فی الارض اور انسانی طبقات کی ایذا رسانی کا حکم دیا ہے لیکن جب اللہ کی سرزمین پر اہل شر نے فساد پھیلانے اور ظلم و بربریت کرنے کی سازشیں رچیں ہیں تو ان الفاظ میں "فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ" ان کی مذمت اور مزاحمت ضرور کی ہے۔

اگر کوئی پلٹائے تو تاریخ کے اوراق　　اسلام کی وحدت میں ہے ہر زہر کا تریاق

اسلاموفوبیا اور ملک کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر مسلمانوں کو قرآن کی تعلیمات کو فروغ دینے اور اسلام و مسلمان کی صحیح تصویر پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ملک و سماج میں اسلام کے خلاف بڑھتی نفرت اور اسلام دشمنی کی فضا کو ختم کیا جاسکے اور حق کے متلاشی اسلامی تعلیمات اور قرآن کی عظمت و شان سے واقف ہوسکیں اور لوگوں میں قرآن مجید سے شغف، قلبی لگاؤ اور اس کے صحیح مطلوب و مقصود کو سمجھنے کا جذبہ پیدا ہوسکے۔ اس لئے کہ یہ دستورِ حیات بھی ہے اور پیام ہدایت بھی، یہ علم کا منبع و ماخذ بھی ہے اور حکمت کا سرچشمہ بھی، یہ احسن الحدیث بھی ہے اور عروۃ الوثقی بھی، یہ دلوں کے ثبات کا ذریعہ بھی ہے اور وسیلۂ عصمت و حفاظت بھی، یہ یقین و تقوی کا راہنما بھی ہے اور ادب گاہ الٰہی بھی، یہ معرفتِ خدا کا راستہ بھی ہے اور سراپا بصیرت و آگاہی بھی، یہ عالم انسانیت کے لئے خیر و بیان بھی ہے اور مسلمانوں کے لئے بشارت بھی، یہ مؤمنین کے لئے شفا و رحمت بھی ہے اور اہل تقوی کے لئے موعظہ اور ہدایت بھی، یہ طہارتِ قلب کا ذریعہ بھی ہے اور پاکیزگیٔ روح کا سبب بھی، یہ روز قیامت شفاعت کرنے والا شفیع بھی ہے اور آخرت کے لئے بہترین توشۂ نجات بھی گویا انسانی زندگی کا کوئی شعبہ خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، قرآنی تعلیمات و فرامین اور اس کے احکامات سے باہر نہیں ہے۔۔۔

شاعر مشرق علامہ اقبال کے بقول:

گر تو می خواہی مسلمان زیستن　　نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

اگر مسلمان بن کر زندہ رہنا چاہتے ہو تو قرآن حکیم پر عمل پیرا ہوئے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔

مسلمانان عالم اگر قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے تو شاید دشمنان اسلام میں توہین قرآن کی جرأت و ہمت ہی پیدا نہ ہوتی جیسا کہ رواں سال میں ایکبار نہیں متعدد مرتبہ سویڈن وغیرہ میں قرآن کو نذر آتش کرنے کا دلسوز واقعہ پیش آیا اور مسلمانوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی! اس بے حسی اور غفلت و بے توجہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ظالم ہر طرف سے مسلط ہوتے گئے اور انہیں ہر طرح کے ظلم و زیادتی کا شکار بنانے لگے۔۔۔ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کو اغیار نے نہیں ان کی بے حسی اور بد عملی نے مارا ہے۔۔۔۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ ۔ بیشک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا؛ جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہ بدل ڈالے۔[1]

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی   نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

موجودہ حالات میں امت مسلمہ خاص کر ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کے پیش نظر ہمیں اپنے تمام مسلکی عقائد و افکار سے بالا اٹھ کر قرآن مجید کے ارشادات و فرامین کی طرف رجوع کرنا ہوگا، اس کے احکام و تعلیمات کو دل سے تصدیق کرنا اور عمل سے اس کا ثبوت دینا ہوگا، ہماری تقدیر اس وقت تک نہیں بدلے گی، اور ہم عزت و سربلندی حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ اس قرآن کا حق ادا نہیں کریں گے، ہمارے عروج و بلندی کے لیے اگر کوئی وسیلہ ہے تو قرآن کریم ہے، ہماری قسمت اسی کتاب کے ساتھ وابستہ ہے، اگر کوئی راستہ کھلے گا تو اسی کے ذریعے کھلے گا اور موجودہ فتنوں کا سدباب اور ظلم و جہالت کی تاریکیاں اس کی روشنی سے ہی ختم ہوں گی۔۔۔۔

مولائے کائنات حضرت امیر المؤمنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام نے فرمایا: (اے لوگو جان لو کہ!) لوگوں پر ایک ایسا دور بھی آنے والا ہے جب قرآن کے صرف نقوش باقی رہ جائیں گے اور اسلام میں صرف نام باقی رہ جائے گا۔۔۔ قرآن کی تعلیم حاصل کرو اس لئے کہ وہ بہترین گفتگو ہے اور اس کی گہرائی میں جاؤ کیونکہ وہ دلوں کی بہار ہے اور اس کے نور سے شفا چاہو کیونکہ وہ دلوں کی شفا ہے۔

"مَا جَالَسَ هٰذَا الْقُرْآنَ اَحَدٌ اِلاّٰ قَامَ عَنْهُ بِزِيَادَةٍ اَوْ نُقْصَانٍ، زِيَادَةٍ فِي هُدىً اَوْ نُقْصَانٍ فِي عَمىً۔" تم جب بھی قرآن کے ساتھ مجالست اختیار کروگے تو تم میں کسی چیز کا اضافہ ہوگا اور وہ ہدایت ہے اور تم میں کسی چیز کی کمی واقع ہوگی اور وہ دلوں کی کوری اور جہالت ہے[2]۔

قرآن مجید سے محبت، قلبی تعلق اور اس سے مستفید ہوئے بغیر خدا، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ اور اہل بیت اطہار علیہم السلام سے وابستگی اور ان کی معرفت کا شعور و احساس پانا، ناممکن ہے! آج ہمارے گھروں میں کتاب خدا موجود تو ہے مگر افسوس! ہم اس کی روشنی سے محروم ہیں، اس کے علم و عرفان اور حکمت سے بے بہرہ ہیں۔۔۔ کبھی اس بابرکت کتاب کی ہدایات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے سبب دنیا میں معزز، باوقار اور بااختیار تھے جبکہ آج! قرآن سے دوری اور اس کی تعلیمات سے انحراف کے سبب ہم زندگی کے ہر موڑ پر ناکامی اور ذلت کے دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں اور اب نہ وہ عظمت ہے نہ وہ ہیبت ہر امور اور مراسم میں شیطانی عناصر کا سایہ اور غیروں کی چھاپ نظر آرہی ہے!

وہ زمانے میں معزز تے مسلماں ہو کر   اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

[1] سورہ رعد آیۃ ۱۱

[2] عیون الحکم والمواعظ، صفحہ ۴۷۸

یہ بات ملحوظ خاطر رکھنے کی ہے کہ کوئی بھی معاشرہ قرآن سے مستغنی نہیں ہوسکتا،یعنی عدل و انصاف اور اخلاقی و انسانی اقدار کی بنیاد پر ایک مثالی گھر،خاندان اور معاشرہ وجود میں لانے کے لئے اگر تمام انسانی علوم اور تجربوں کو استعمال کیا جائے اور تمام افکار و خیالات اکٹھا ہو جائیں، تب بھی قرآن کے بغیر ہرگز صحیح راستہ اور صحیح منزل نہیں پاسکتے۔

شیخ عبد الکریم حائری مؤسس حوزہ علمیہ قم فرماتے ہیں کہ سرکار ختمی مرتبت ﷺ نے ہمارے لیے دو گرانقدر چیزیں ودیعت میں چھوڑی ہیں ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے اہل بیت علیہم السلام،مگر افسوس!

اہل سنت نے قرآن لے لیا اور دامن اہل بیت علیہم السلام کو چھوڑ دیا اور ہم شیعہ حضرات دامن اہل بیت علیہم السلام سے متمسک ہوئے تو قرآن کی عظمت و معرفت سے غافل ہو گئے۔

یقیناً!اللہ کا یہ بابرکت کلام جو ہمارے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ و آلہ پر نازل ہونے والا زندہ و جاوید معجزہ اور خالق و مخلوق کے درمیان رابطہ کا بہترین ذریعہ ہے ہمارے درمیان آج بھی مہجور و متروک واقع ہے!یہ عجیب المیہ ہے کہ ہمارا سونا جاگنا،اٹھنا بیٹھنا،کھانا پینا گویا ہماری ہر حالت خود ساختہ قوانین کی پابند تو نظر آتی ہیں مگر خدا کے بنائے قرآنی تعلیمات کو منشور زندگی بنانے اور اس راہ میں جد و جہد کے بجائے اسے نظر انداز کرتے ہیں۔

اس ناگفتہ بہ حالات کا مرثیہ اللہ کی کتاب خود ان الفاظ میں یوں پڑھتی نظر آتی ہے:اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ اہل کتاب کے ایک گروہ نے کتابِ خدا کو اس طرح پس پشت پھینک دیا گویا وہ کچھ جانتے ہی نہیں[1]۔

آج!اپنے ارد گرد نظر دوڑائیے،دیکھئے، سمجھئیے اور محسوس کیجئے کہ دنیا کے ہر اس خطہ میں جہاں مسلمان آباد ہیں وہاں،طاغوتی و سامراجی قوتوں کے تسلط کی شکل میں مذہبی،علاقائی اور فرقہ وارانہ کشیدگی کی ایک عذاب کی صورت ان پر مسلط ہے اور یہ ہو بھی کیوں نہ کہ جب ہم بحیثیت مسلمان قرآنی تعلیمات کو اپنا نصاب زندگی بنانے کے بجائے دوسروں کے طرز زندگی کو اپنانے کی دوڑ بھاگ میں اپنا سرمایہ حیات ضائع کرنے میں لگے ہیں۔ تو دوسری جانب ہمارا گھر،خاندان اور سماج نے جہنم کدے کی صورت اختیار کر رکھی ہے!نہ وہ ماضی ہے نہ وہ تہذیب،نہ وہ اخلاق ہے نہ وہ کردار،نہ وہ عادات ہیں نہ وہ انداز و اطوار،نہ اتحاد ہے نہ اتفاق،نہ ہمارے اندر بڑے،بزرگوں کا احترام رہا،نہ احساس،شرافت و ایمانداری اور ایک دوسرے کے لئے محبت و ہمدردی کا تو جیسے مفہوم ہی ناپید ہو گیا ہے حلال اور حرام میں فرق کرنا بھی اب مشکل ہی نہیں بہت مشکل ہو چکا ہے۔ ہر شخص خود غرضی کے خول میں بند نظر آتا ہے۔ ہر شخص اپنے بارے میں سوچتا ہے۔علم و دانش، سمجھداری و بردباری اور باہمی تعاون اور آپسی ایثار و ہمدردی کے لحاظ سے ہمارا پورا معاشرہ بے حسی اور لاپروائی کی دلدل میں دھنستا جا رہا ہے۔ عقل حیران ہے کہ دنیا کہاں جا رہی ہے اور ہم کس سمت جا رہے ہیں۔ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہماری منزل کہاں ہے!ہم

---

[1] سورہ بقرہ/۱۰۱

خود کو تعلیم یافتہ سمجھنے کے باوجود تہذیب یافتہ کیوں نہیں ہیں! کرپشن، بدعنوانی، بداخلاقی، بد عملی، بے دینی، بے حیائی، بے شرمی اور بے پردگی جیسی اخلاقی برائیوں نے ہمیں موت سے ہمکنار کرنے والے بھیانک مرض میں مبتلا کر رکھا ہے۔۔۔

ہمیں موجودہ مادی دور میں ہر مسلک و ملت اور ہر شخص سے زیادہ قرآن اور محافظین قرآن کی تعلیمات پر غور و فکر کرنے اور اسے فروغ دینے کی ضرورت تھی مگر! ہم ہی سب سے زیادہ دنیوی عیش و عشرت کے حصول میں مگن؛ قرآنی تعلیمات سے کنارہ کش ہیں۔ جس طرح ہمیں قرآن مجید سے بہرہ مند اور طالبِ ضیا ہونا چاہئیے تھا اس سے اتنا ہی بے رغبت و بے نور نظر آتے ہیں۔۔۔ ہمارے دینی مکاتب و مدارس، اسکول، کالج اور دیگر دینی اور دنیوی ادارے بالخصوص ہماری دینی محافل و مجالس میں "کتاب اللہ" کی جو صورتحال ہے وہ ہر صاحب علم و فہم پر عیاں ہے کہ:

ضبط کرتا ہوں تو ہر زخم لہو دیتا ہے شکوہ کرتا ہوں تو اندیشہ رسوائی ہے

آخر کیا وجہ ہے کہ ہمارے درمیان "قرآن" جیسا ہادی و راہنما، قرآن جیسا علم و دانش کا سرچشمہ اور قرآن جیسا "صحیفہ انقلاب" تو موجود ہے لیکن ہم میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں ہوتا؟! اس کی خاصیت تو یہ ہے کہ اس پر غور و فکر کرنے، اسے پڑھنے اور پڑھ کر اس پر عمل کرنے سے اس کا اثر روح و جان کے اندر داخل ہوتا ہے تو وہ جان بدل جاتی ہے (اس میں انقلاب آجاتا ہے) اور جان بدل جائے تو پھر جہان بدل جاتا ہے مگر افسوس! ہم میں کوئی جنبش نہیں ہوتی! پھر ہمیں ان افراد اور اس سماج سے تحفظ دین کی کیا توقع ہو سکتی ہے جہاں قرآن ہو انقلاب نہ ہو، جہاں قرآن ہو اخلاق نہ ہو، جہاں قرآن ہو تعلیماتِ قرآن نہ ہو، جہاں قرآن ہو عدالت نہ ہو، جہاں قرآن ہو جذبہ ایثار و شہادت نہ ہو، جہاں قرآن ہو شجاعت و صلابت نہ ہو، جہاں قرآن ہو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ ہو! قرآن ہو لیکن دل سوز گداز سے خالی ہوں، قرآن ہو خوف خدا نہ ہو، قرآن ہو اور آنکھیں نم نہ ہو، قرآن ہو لیکن نیکی پر بدی کا غلبہ ہو، قرآن سے محض عقیدت کے دعوے ہوں اور پیروی اور اتباع دشمنان قرآن و اہل بیتؑ کی ہو، قرآن ہو اور معاشرہ میں سود و شراب خوری، چوری، زنا، بے حیائی، بے پردگی، بے شرمی، کم فروشی اور بے راہ روی جیسی مہلک بیماری کا سدباب نہ ہو، معاشرہ میں تزکیہ نفس اور حکمت کی باتیں نہ ہوں تو اس قرآن اور ایسے مسلمانوں کا کیا فائدہ!؟

دنیا کی خرافات میں مغرور ہوئے ہیں ہم لوگ تلاوت سے بہت دور ہوئے ہیں
گھر گھر نظر آتے ہیں طاقوں میں قرآن ہم کیسے مسلمان ہیں ہم کیسے مسلمان؟

کیا آپ جانتے ہیں؟! سامراج اور اسلام دشمن عناصر نے مسلمانوں کو قرآن مجید جیسی مقدس کتاب سے دور رکھنے کی نہ جانے کیسی کیسی چالیں چلیں ہیں! اگر نہیں جانتے ہیں تو پھر اس پر غور کریں: ایک مدت سے اسلام دشمن عناصر کا منصوبہ یہی ہے کہ مسلمانوں پر پروپیگنڈا، تہذیبی یلغار اور ثقافتی جنگ کے علاوہ اگر غالب آیا جاسکتا ہے تو انہیں حقیقی اسلام اور صحیح قرآن کی تعلیمات سے دور رکھا جائے

جیسا کہ برطانیہ کاوزیر خارجہ ایڈن برطانوی پارلیمنٹ میں یہ اعلان کرتا ہے کہ جب تک مسلمانوں کے درمیان یہ قرآن موجود ہے ہم ان پر غالب نہیں آسکتے۔"[1]

"نپلون" نے مصر کے کتاب خانے میں قرآن کی اس آیت " ﴿إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا﴾۔ بیشک قرآن اس راستہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور ان صاحبانِ ایمان کو بشارت دیتا ہے جو نیک اعمال بجالاتے ہیں کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ "کو دیکھنے کے بعد یہ بات کہی کہ: میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر مسلمان اس کے آئین و قوانین پر عمل کریں تو ہرگز ذلیل و خوار نہیں ہوں گے کیونکہ یہ ان کے درمیان حاکم و ناظر ہے، مگر یہ کہ ہم ان کے اور قرآن کے درمیان جدائی ڈال دیں[2]۔

آئیے! اس دنیا میں اپنا کھویا ہوا وقار اُلٹی ہوئی عظمت و اُبہت کی بحالی او آخرت میں سرخ روئی اور کامیابی کے لئے بجائے گوگل، سوشل میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ پر سرچ کرنے کے اپنے زندگی کے تمام مسائل کا حل کلام الہی میں تلاش کریں اسے پڑھیں اس پر عمل کریں اور اس میں غوطہ زن ہو کر اپنے کردار میں جت پیدا کریں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اسلام دشمن عناصر کی اسلام دشمنی، اپنے گھر و خاندان اور سماج کے بگڑتے ہوئے دینی، ثقافتی، اخلاقی سماجی اور سیاسی حالات کو مد نظر رکھ کر موڈرن ازم کے فرسودہ "ماڈرنیٹی" کے لپکتے شعلوں سے اپنے گھر، خاندان اور سماج کو محفوظ بنانے کے لئے ہر چیز کو بالائے طاق رکھ کر بحیثیت مسلمان، قرآن سیکھیں، سیکھائیں اس کی تعیمات اور اس کے حکم کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالیں، اس کی معرفت کے سرچشمہ سے اپنی نسلِ نو کو سیراب کریں، اس کے معانی و مقصود کو سمجھیں، اس کی آیتوں پر غور و فکر کریں! ترکِ قرآن دنیا و آخرت دونوں جہاں میں ناکامی خست و ذلت کا باعث ہے اور اس پر عمل پیرا ہونا اور اسے اپنا دستور حیات بنانا اور اس کے پیغام کو عام کرنا اور اس کو سیکھنے سمجھنے اور اس کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنانا دونوں جہاں میں چین و سکون اور راحت و آرام اور ہر دو جہاں کی کامیابی و کامرانی نصیب ہو سکتی ہے ورنہ یہ یہاں بھی پریشانیوں کی آماجگاہ اور روز قیامت بھی سوائے افسوس، ناکامی اور نامرادی کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

نہ ہاتھ آئے گا حسرت کے ماسوا کچھ بھی ہے خواہشات کی دنیا سراب کی مانند

حضرت امیر المومنین حضرت علیؑ- نہج البلاغہ میں خطبہ ۱۵۷ کے شروع میں اسی بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور فردی و اجتماعی مشکلات کے حل کا راستہ قرآن کی طرف رجوع اور اس کے احکام پر عمل کرنے کو بتاتے ہیں۔ نیز آپؑ فرماتے ہیں: تلاوتِ قرآن سے غفلت نہ برتو کیونکہ قرآن کریم مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے، برائیوں، ناپسندیدہ باتوں اور گناہوں سے روکتا ہے۔[3]

---

[1] علل پیشرفت اسلام و انحطاط مسلمیں، صفحہ ۳۳۴

[2] علل پیشرفت اسلام و انحطاط مسلمیں، ص ۳۳۴

[3] میزان الحکمۃ مادہ "ق"

آیئے! قرآن کے اس فریاد کو بغور سنیں "وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰارَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا"[1]
اور اس کتاب ہدایت اور دستورِ حیات کو اپنے ہر شعبۂ حیات میں دستور العمل بناتے ہوئے اس فریاد کا مداوی اس کے احکام و مسائل پر عمل در آمد ہو کر پیش کریں اور خود سے یہ عہد کریں کہ ہم قرآن اور محافظین قرآن (یعنی اہل بیتؑ رسالتؐ) کے دامن سے متمسک ہو کر اپنے گھر، خاندان، محلہ، شہر و ملک اور پورے سماج و معاشرہ میں قرآن و اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کو فروغ دینے کی کوشش کریں گے اور آنے والی نئی نسلوں کو قرآن سیکھنے، سمجھنے، پڑھنے اور اس کے مفاہیم و مطالب سے آشنا کرنے کے ذرائع پیدا کریں گے تاکہ وہ قرآن و اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات سے مانوس رہیں۔

میں قرآں پڑھ چکا تو اپنی صورت ہی نہ پہچانی میرے ایمان کی ضد ہے مرا طرز مسلمانی

[1] سورہ فرقان آیت ۳۰

تقیہ کی حیثیت تاریخ کے آئینے میں

(اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد)

سید منظور عالم جعفری سرسوی

اگر تقیہ کی حقیقت کے بارے میں تھوڑا بھی غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تقیہ نہ صرف شریعت اسلامی میں جائز ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا فطری اور عقلی قانون ہے کہ جس کو سارے عقلاء ہر زمانے میں قبول کرتے رہے اور زندگی کے مختلف انفرادی اور اجتماعی امور میں اس سے فائدہ اٹھاتے رہے کیونکہ یہ ایک فطری چیز ہے کہ ہر عاقل انسان جب اپنے عقیدے کے اظہار سے اپنی جان، مال، ناموس اور عزت کو خطرے میں دیکھتا ہے تو وقتی طور پر اپنے عقیدے کے اظہار سے پرہیز کرتا ہے۔ اور اپنے کو دشمن کے شر سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسے کام کو انجام نہیں دیتا جس سے دشمن کو کامیابی ملے اور اس کو اور اس کے مذہب کو نیست و نابود کرنے کی سازش میں دشمن کامیاب ہو جائے۔

لیکن تقیہ پر عمل کرنے کے حوالے سے شیعہ حضرات دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے زیادہ مشہور ہیں۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ مختلف ادوار میں اپنے مخالفین کی جانب سے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور اقتصادی ظلم کا شکار رہے ہیں۔

اکثر مذاہب اہل سنت بھی جانی اور مالی نقصان کا اندیشہ ہونے کی صورت میں نقصان سے بچاؤ کی حد تک تقیہ کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ اسلامی مذاہب میں سے صرف زیدی اور وہابی فرقہ تقیہ کے خلاف ہیں۔

لہٰذا ہم سب سے پہلے تقیہ کی تعریف اور اس کے بعد اسکی تاریخی حثیت پر بحث کریں گے

تقیہ کے معنی

لغوی اعتبار سے تقیہ "وقی" سے مأخوذ ہے۔ جس کے معنی کسی کی تکلیف اور آزار سے بچنے کی خاطر اس سے محفوظ رہنے، رکنے اور کسی چیز کو اس سے چھپانے کے ہیں[1]۔ شیعہ علماء اور فقہاء نے مختلف انداز اور کلمات کے ذریعے تقیہ کی تعریف کی ہے لیکن سب کے مضمون اور مفہوم ایک ہیں

شیخ مفید رضوان اللہ تعالی علیہ تقیہ کی تعریف میں لکھتے ہیں: دینی یا دنیوی نقصان سے بچنے کی خاطر حق اور اپنے عقیدے کو اپنے مد مقابل مخالف سے چھپانے کو تقیہ کہتے ہیں[2]۔

شیخ انصاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: کسی مخالف شخص کے نقصان سے بچنے کے لیے اس کے ساتھ گفتار اور کردار کے لحاظ سے اس جیسے عمل کرنا تقیہ کہلاتا ہے[3]۔

---

[1] ابن منظور، لسان العرب، لفظ "وقی" کے ذیل میں

[2] شیخ مفید، تصحیح الاعتقادات الامامیۃ، ۱۴۱۴، ص ۱۳۷.

[3] شیخ انصاری، مسائل فقہیۃ، ۱۴۱۴ ص ۷۱.

اہل سنت کے مشہور فقیہ، شمس الدین سرخسی حنفی، نے تقیہ کی یوں تعریف کی ہے۔ تقیہ یہ ہے کہ کوئی اپنے آپ کو عقوبت اور سزا سے بچانے کے لئے ایسی چیز کا اظہار کرئے جس پر اس کا عقیدہ نہیں ہے[1]۔

یہ شیعہ اور سنی علماء کی نگاہ میں تقیہ کی تعریف تھی اب تاریخ میں اس کی کیا حیثیت ہے اس پر گفتگو کرتے ہیں۔

تقیہ کی حیثیت تاریخ کے آئینے میں

الف: اسلام سے قبل تقیہ

اس میں شک نہیں ہے کہ اپنے عقیدے کا اظہار کرنا اور اس کی دوسرے اقوام میں تبلیغ کرنا فائدہ مند اور ایک اہم اقدام ہے۔ لیکن اگر عقیدے کے اظہار کا نہ صرف فائدہ نہ ہو بلکہ اس سے مادی اور معنوی یا جانی نقصان کا احتمال ہو تو اس موقع پر عقلاء، حق کے اظہار سے چشم پوشی کرتے ہیں اور اپنے عقیدے کو مخفی رکھنے کی اجازت دیتے ہیں یہاں تک کہ بعض موقعوں پر تو تقیہ کو واجب سمجھتے ہیں۔ اگر ایسا کوئی شخص یہ جانتے ہوئے کہ عقیدے کا اظہار کرنا اس کے لئے ضرر کا باعث ہے لیکن پھر بھی عقیدے کا اظہار کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں نقصان اٹھاتا ہے تو عقلاء اس کی مذمت کرتے ہیں اور اس کے کام کو غیر عقلائی کام سمجھتے ہیں۔

آئمہ معصومین علیہم السلام کی بعض روایات میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ماسبق انبیاء علیہم السلام جیسے حضرت شیث، حضرت ابراہیمؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ، مومن آل فرعون اور اصحاب کہف سے متعلق تقیہ کی داستانیں ملتی ہیں۔

سب سے پہلے جس نبی نے تقیہ کیا وہ حضرت شیثؑ تھے جنھوں نے جناب ہابیل کی شہادت کے بعد اپنے بھائی قابیل سے تقیہ کیا اور اپنے علم کو حکم خداوندی سے مخفی رکھا[2]۔

جب حضرت ابراہیم نے بت پرستوں کے بتوں کو خاک میں ملایا اور اس کے بعد آپ کو گرفتار کر کے نمرود کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے اس وقت تقیہ سے کام لیا[3] جیسا کہ قرآن کریم میں خداوند متعال کا ارشاد ہے: **قَالُوا أَأَنْتَ فَعَلْتَ هَٰذَا بِآلِهَتِنَا يَا إِبْرَاهِيمُ *قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَٰذَا فَاسْأَلُوهُمْ إِنْ كَانُوا يَنْطِقُونَ*** پھر ان لوگوں نے ابراہیمؑ سے کہا کہ کیا تم نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہے ابراہیمؑ نے کہا کہ یہ ان کے بڑے نے کیا ہے تم ان سے دریافت کر کے دیکھو اگر یہ بول سکیں[4]۔

حضرت یوسفؑ کا واقعہ خود ان کی زبانی تفصیل کے ساتھ سورہ یوسف میں منقول ہے، جب جناب یوسفؑ نے اپنے سگے چھوٹے بھائی کو دیکھا تو آپ نے فرمایا: **وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ** *اور جب وہ لوگ یوسف کے سامنے حاضر ہوئے تو انہوں نے اپنے بھائی کو اپنے پاس پناہ دی اور کہا کہ میں

---

[1] شمس الدین السرخسی، المبسوط، ج ۲۴، ص ۴۵

[2] علامہ مجلسی، بحار الانوار، ج ۷۵، ص ۴۱۹

[3] حر عاملی، وسائل الشیعہ، ۱۴۱۰، ج ۱۶، ص ۲۰۸.

[4] سورہ انبیاء آیت ۶۲-۶۳

تمہارا بھائی یوسف ہوں لہٰذا جو برتاؤ یہ لوگ کرتے رہے ہیں اب اس کی طرف سے رنج نہ کرنا پھر اس کے بعد ارشاد رب العزت ہورہا ہے: فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ* اس کے بعد جب یوسف نے ان کا سامان تیار کرا دیا تو پیالہ کو اپنے بھائی کے سامان میں رکھوا دیا اس کے بعد منادی نے آواز دی کہ قافلے والو تم سب چور ہو[1] پھر ارشاد ہوا: فَبَدَأَ بِأَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِن وِعَاءِ أَخِيهِ كَذَٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّن نَّشَاءُ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ * : اس کے بعد بھائی کے سامان سے پہلے دوسرے بھائیوں کے سامان کی تلاشی لی اور آخر میں بھائی کے سامان میں سے پیالہ نکال لیا.... اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کے حق میں تدبیر کی کہ وہ بادشاہ کے قانون سے اپنے بھائی کو نہیں لے سکتے تھے مگر یہ کہ خدا خود چاہے ہم جس کو چاہتے ہیں اس کے درجات کو بلند کردیتے ہیں اور ہر صاحب علم سے برتر ایک صاحب علم ہوتا ہے[2]۔ اسی واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: التقیه من دین الله!قلت:من دین الله؟ قال علیه السلام:ای والله من دین الله لقد قال یوسف: ایتها العیر انکم لسارقون والله ما کانوا سرقوا شیء. : تقیہ دین خدا میں سے ہے، میں نے سوال کیا: کیا دین خدا میں سے ہے ؟تو فرمایا: ہاں خدا کی قسم؛دین خدا میں سے ہے بے شک یوسفؑ نے فرمایا: اے قافلہ والو بدون شک تم لوگ چور ہو؛ درحالیکہ خدا کی قسم انہوں نے کوئی چوری نہیں کی تھی[3]۔

قرآن کریم نے حضرت موسیٰؑ کی شجاعت کے بارے میں مختلف مقامات پر اشارہ کیا ہے کہ کس طرح فرعون کے ساتھ روبرو ہوئے لیکن ان تمام شجاعت اور فضیلتوں کے باوجود آپؑ نے اپنی زندگی میں کئی موقعوں پر لوگوں کو رسالت کی تبلیغ کے دوران تقیہ کیا ہے۔اور یہ تقیہ اپنی جان کے خوف سے نہیں بلکہ باطل کا حق پر غلبہ پانے کے خوف سے کیا ہے۔جب خدا نے جناب موسیٰؑ اور جناب ہارونؑ کو حکم دیا: اذْهَبَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ * تم دونوں فرعون کی طرف جاؤ کہ وہ سرکش ہوگیا ہے . اس سے نرمی سے بات کرنا کہ شاید وہ نصیحت قبول کرلے یا خوف زدہ ہوجائے۔اور فرعون کے ساتھ نرم اور میٹھی زبان میں بات کرنا اور اعلان جنگ نہ کرنا، جبکہ وہ طغیان اور نافرمانی کے عروج پر تھا ایک قسم کا تقیہ ہے۔

جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے قتل کا ارادہ کیا اور اپنے حواریوں سے مشورہ کرنے لگا، تو مؤمن آل فرعون اس ناپاک سازش سے آگاہ ہوا تو سخت فکر مند ہوا، تو اس نے فرعون کو یوں مشورہ دیا: وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَن يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُم بِالْبَيِّنَاتِ مِن رَّبِّكُمْ وَإِن يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ وَإِن

---

[1] سورہ یوسف آیت ۷۰

[2] سورہ یوسف آیت ۷۶

[3] تاریخ الامم والملوک،ج۱،ص ۱۷۱

[4] سورہ طٰہ آیت ۴۳-۴۴

يَكُ صَادِقًا يُصِبْكُم بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ* اور فرعون والوں میں سے ایک مرد مومن نے جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا، یہ کہا کہ کیا تم لوگ کسی شخص کو صرف اس بات پر قتل کر رہے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے اور وہ تمہارے رب کی طرف سے کھلی ہوئی دلیلیں بھی لے کر آیا ہے اور اگر جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا عذاب اس کے سر ہوگا اور اگر سچا نکل آیا تو جن باتوں سے ڈرا رہا ہے وہ مصیبتیں تم پر نازل بھی ہو سکتی ہیں — بیشک اللہ کسی زیادتی کرنے والے اور جھوٹے کی رہنمائی نہیں کرتا ہے[1]۔ مومن آل فرعون کا اپنے ایمان کو چھپانا بھی تقیہ کیوجہ سے تھا۔

خداوند عالم نے اصحاب کہف کے واقعے میں بیان فرمایا ہے: فَابْعَثُوا أَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهِ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلْيَنْظُرْ أَيُّهَا أَزْكَى طَعَامًا فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا* إِنَّهُمْ إِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوا إِذًا أَبَدًا* اب تم اپنے سکے دے کر کسی کو شہر کی طرف بھیجو وہ دیکھے کہ کون سا کھانا بہتر ہے اور پھر تمہارے لئے رزق کا سامان فراہم کرے اور وہ آہستہ جائے اور کسی کو تمہارے بارے میں خبر نہ ہونے پائے۔ یہ اگر تمہارے بارے میں باخبر ہوگئے تو تمہیں سنگسار کر دیں گے یا تمہیں بھی اپنے مذہب کی طرف پلٹا لیں گے اور اس طرح تم کبھی نجات نہ پاسکو گے[2]۔ شیعہ اور اہل سنت کے مفسروں نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ اس آیت میں « وَلْيَتَلَطَّفْ» سے مراد تقیہ ہے۔ جب اصحاب کہف میں سے ایک نیند سے اٹھنے کے بعد کھانا لانے شہر جانا چاہا تو اس کے دوستوں نے کہا: احتیاط سے کام لینا تاکہ دشمن کو مخفی گاہ کا علم نہ ہو کیونکہ حاکموں سے ان کی جانوں کو خطرہ لاحق تھا۔ یہ وہی تقیہ ہی ہے کہ جس کے شیعہ قائل ہیں، لیکن ان کے مخالفین اس کی شرعی حیثیت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں[3]۔

ب: اسلام کے بعد تقیہ

محسن اسلام حضرت ابوطالبؑ نے بھی دین اسلام اور رسول اسلام ﷺ کی حفاظت کو مد نظر رکھتے ہوئے تقیہ اختیار کیا لہذا امام صادقؑ نے فرمایا: إِنَّ مَثَلَ أَبِي طَالِبٍ مَثَلُ أَصْحَابِ الْكَهْفِ أَسَرُّوا الْإِيمَانَ وَ أَظْهَرُوا الشِّرْكَ فَآتَاهُمُ اللَّهُ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ. بے شک ابوطالبؑ کی مثال اصحاب کہف کی مثال ہے، انہوں نے اپنا ایمان چھپائے رکھا اور شرک کا اظہار کیا، خدا تعالیٰ انہیں قیامت کے دن دو دفعہ ثواب عطا کریگا[4] اور امام حسن عسکری علیہ السلام نے فرمایا: ان ابا طالب کمؤمن آل فرعون یکتم ایمانه- حضرت ابوطالبؑ بھی مؤمن آل فرعون کی طرح اپنا ایمان کفار قریش سے چھپا رکھا تھا[5]۔

---

[1] سورہ غافر آیت ۲۸

[2] سورہ کہف آیت ۱۹-۲۰

[3] علامہ مجلسی، بحارالانوار، ج ۷۵، ص ۴۲۹ و ج ۱۴، ص ۴۲۵-۴۲۶.) اور (فخرالدین الرازی التفسیر الکبیر أو مفاتیح الغیب، ج ۲۱، ص ۸۸

[4] الکافی باب مولد النبی و وفاتہ، ج ۱، ص ۴۴۸

[5] وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۸۳

اسی طرح جناب عمار یاسر نے مجبور ہو کر جو کفار نے ان سے کہا تھا، وہی کلمات زبان پر جاری کر دیے۔ تو لوگوں نے یہ خبر رسول اللہ ﷺ کو دی. لوگوں نے کہا: عمار کافر ہوگئے۔ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ہر گز ایسا نہیں ہے؛ عمار ایمان سے لبریز ہے، ایمان عمار کے گوشت اور خون کے ساتھ ملا ہوا ہے.

جناب عمار، جناب رسول خدا ﷺ کے پاس روتے ہوئے آئے؛ رسول خدا ﷺ نے عمار سے کہا: کیا ہوا ہے؟ عمار نے جواب دیا: ایک برا کام انجام پایا ہے: میں اس وقت تک آزاد نہیں ہوا جب تک آپ کو برا بلا نہ کہا اور کفار کے خداوں کی تعریف کرنی پڑی۔ رسول خدا ﷺ نے اس کے آنسوں کو صاف کیا اور فرمایا: اگر دوبارہ کفار نے تیرے ساتھ ایسا کیا تو پھر ایسا ہی کرنا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْراً فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ * جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ کا انکار کرے (اس کے لیے سخت عذاب ہے) بجز اس شخص کے جسے مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو (تو کوئی حرج نہیں) لیکن جنہوں نے دل کھول کر کفر اختیار کیا ہو تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔[۲]

پیغمبر اکرم ﷺ نے بھی اپنی حیات میں مختلف مواقع پر تقیہ کا سہارا لیا ہے، جیسا کہ بعثت سے تین سال قبل تک مخفی طور پر دعوت اسلام دینا، اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر سہیل بن عمرو مشرکین کا نمایندہ تھا آپ نے اس کی درخواست پر "بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ" کی جگہ "باسمك اللهم" لکھا، اور رسول اللہ ﷺ کے عنوان کو حذف کر کے محمد بن عبد اللہ لکھا جو بھی ایک تقیہ ہے[۳]۔ یا اسی طرح عبد اللہ بن ابی کی نماز پڑھنا اور اور دعا کے بجائے آہستہ سے نفرین کرنا جبکہ وہ منافقین مدینہ کا سردار تھا موارد تقیہ میں سے ہے[۴]۔

مولائے متقیان علی بن ابی طالب علیہ السلام کا سقیفہ کے بعد ۲۵ سال تک خاموش رہنا جب کہ قرآن کریم اور پیغمبر ﷺ کے غدیر اور اس سے قبل و بعد کے اکثر مواقع پر آپؑ کو خلیفہ بلا فصل ہونے کے اعلان کرنے کے باوجود امت کی وحدت کی خاطر خاموش رہنا بھی تقیہ ہی تھا۔

اسی طرح دیگر معصومین علیہم السلام کی زندگی میں بھی تقیہ کی مختلف اقسام سے شواہد مل جائیں گے۔ جیسا کہ امام حسنؑ کا صلح کرنا امام حسینؑ کا معاویہ کی زندگی میں قیام نہ کرنا، امام زین العابدینؑ کا دعاوں اور مناجات کی شکل میں تبلیغ دین کرنا، امام باقرؑ اور صادقؑ کا ہشام کے دربار میں تقیہ اختیار کرنا، امام موسی کاظمؑ کا علی بن یقطین کو اہل سنت کے مطابق وضو کی تلقین کرنا بھی تقیہ کے جواز کی واضح دلیل ہے۔ امام رضاؑ کا ولی عہدی کو قبول کرنا بھی تقیہ کیوجہ سے تھا۔ امام جوادؑ کا مامون اور معتصم کے

---

[۱] سورہ نحل آیت ۱۰۶

[۲] أمین الاسلام الطبرسی، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ج ۲، ص ۲۰۳-، فخر الدین الرازی التفسیر الکبیر أو مفاتیح الغیب، ج ۲۰، ص ۱۲۱

[۳] ابن ہشام السنۃ النبویہ ج ۳ ص ۳۱۷

[۴] وسائل الشیعہ ج ۹ ص ۲۲۸-۲۲۹

دور حکومت میں قنوت کو ترک کرنا بھی تقیہ ہی کی بناپر تھا[1]۔امام علی نقیؑ سے جب علی بن مھزیار نے سوال کیا کیا ہم اہل سنت کے مطابق مال تقسیم کر سکتے ہیں ؟آپؑ نے فرمایا: ہاں، تمہارے لیے ایسا کرنا جائز ہے جبکہ تقیہ اور مدارات کی حالت میں ہو[2]۔امام حسن عسکریؑ کا امام مھدی علیہ السلام کی ولادت کو مخفی رکھنا اور صرف اپنے خاص شیعوں کو مطلع کرنا بھی تقیہ کیوجہ سے تھا۔امام مھدی علیہ السلام کا غیبت صغری کے زمانہ میں بذات خود امت کے مسائل کا حل نہ کرنا بلکہ نواب اربعہ کا سہارا لینا بھی تقیہ ہی کیوجہ سے تھا۔

اسی طرح اصحاب نبی اکرم ﷺ نے بھی مختلف مواقع پر تقیہ کا سہارا لیا ہے، جیساکہ فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے مسیلمۃ کذاب نے اصحاب رسول خداﷺ میں سے دو نفر کو گرفتار کیا۔ان میں سے ایک سے کہا: کیا گواہی دیتے ہو؛ محمد ،اللہ کے رسول ہیں؟ان نے جواب دیا: جی ہاں، جی ہاں۔دوبارہ سوال کیا: کیااس چیز کی گواہی دیتے ہو کہ میں بھی اللہ کا رسول ہوں؟صحابی نے جواب دیا: جی ہاں [3]۔

ابن حزم اندلسی نے المحلی میں نقل کیاہ عبداللہ بن مسعود سے سنا ہے: کوئی بھی صاحب قدرت مجھے ایسی بات کہنے پر مجبور کر دئے جو مجھ سے ایک یا دو تازیانوں کو دور کر سکے تو میں ایسا کہہ دوں گا {تاکہ اس کے تازیانے سے بچھ نکلے } [4]

اہل سنت کی کتابوں میں بہت سی ایسی روایتیں ہیں کہ جو یہ بتاتی ہیں کہ ابن عباس تقیہ کے معقد تھے، جیساکہ محمد بن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں نقل کیاہے :ابن عباس سے اللہ کے اس کلام «إلا أن تتقوا منهم تقاة» کے بارے میں نقل ہوا ہے: تقیہ زبان سے ہوتا ہے، کسی کو ایسی بات کہنے پر مجبور کیا جائے جو اللہ کی نافرمانی شمار ہوتی ہے اور وہ بھی خوف کی وجہ سے اس کو زبان پر لاتا ہے، لیکن اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو تو ایسے میں ظاہری بات اس کے ایمان کو نقصان نہیں پہنچاتی، اس کا یہ تقیہ صرف زبانی ہے [5]۔

نتیجہ:

تقیہ کا شرعی اور عقلی طور پر جائز ہونا نہ صرف یہ کہ اسلام میں ثابت ہے اور اس کے شواہد ملتے ہیں بلکہ اسلام سے قبل بھی انبیاءؑ اور عقلاء کی سیرت بھی خوف کے موقعوں پر تقیہ اختیار کرنا تھی، مذہب ائمہ اہل بیت علیہم السلام میں تقیہ مسلمات اور یقینی باتوں میں سے ہے ،اہل سنت کے علماء نے بھی اپنی گفتار اور رفتار کے ذریعے تقیہ کا شرعی طور پر جائز ہونے اور عقلی ،قرآنی اور حدیثی دلائل سے اس کو ثابت کیا ہے۔نبی اکرم ﷺ اور آپ کی وفات کے بعد سیرت اصحاب اور سیرت آئمہ اہل بیت علیہم السلام تقیہ کی ضرورت اور جواز پر بہترین دلیل ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۴،ح ۱،ص ۱۶۵

[2] وسائل الشیعہ ج ۴،ح ۱،ص ۱۶۵

[3] فخر الدین الرازی،التفسیر الکبیر أومفاتیح الغیب،ج ۸،ص ۱۲

[4] إبن حزم الظاہری، المحلی،ج ۸،ص ۳۳۶.

[5] أبی جعفر محمد بن جریر الطبری،جامع البیان عن تأویل آی القرآن،ج ۳،ص ۲۲۹

فرقہ ناجیہ متفقہ احادیث کی روشنی میں

ڈاکٹر ذیشان حیدر عارفی

خداوند عالم نے انسان میں اپنی روح پھونک کر اس کو اشرف المخلوقات بنایا پھر اسے زمین پر اتارا کر اس کی سماجی اور عبادی زندگی کے لئے اصول بنائے اور ان کو اپنے معصوم نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ ابلاغ فرمایا جن کو شریعت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن ہر دور میں خواہشات کے پجاریوں نے خدا کے دین سے فرار کی خاطر وقت کے معصوم رہبروں کی مخالفت کی اور اپنی من چاہی کرنے کی خاطر نئی نئی چیزوں اور باتوں کو دین بنا دیا جس سے بڑے آسمانی ادیان جیسے مجوسی، یہود، نصاری اور مسلمان بھی محفوظ نہ رہ سکے جیسا کہ حضور ﷺ کی مندرجہ حدیث سے واضح ہے:

''مجوسی ستر فرقوں میں، یہودی اکہتر فرقوں میں اور عیسائی بہتر فرقوں میں تقسیم ہوگئے اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی ان میں سے صرف ایک ہی فرقہ نجات یافتہ ہے''[1]۔

مسلمانوں کے اکثر علماء اس حدیث پر ایمان رکھتے ہیں صرف فرق یہ ہے کہ ان میں ہر ایک اپنے فرقہ کو نجات یافتہ اور دوسرے کو گمراہ تصور کرتا ہے مثلا: شہرستانی نے ملل والنحل [2] میں ''اہل سنت'' کو فرقہ ناجیہ قرار دیا، جمال الدین رازی نے اپنی کتاب ''تبصرۃ العوام فی معرفۃ مقالات الانام'' میں [3] ''امامیہ'' (شیعہ اثنا عشری) کو فرقہ ناجیہ قرار دیا اور جعفر بن منصور الیمن اسماعیلی نے اپنی کتاب ''سرائر واسرار النطقاء میں'' [4] اسماعیلیہ کو ناجیہ قرار دیا ہے۔

ہر ایک کے پاس اپنی اپنی خاص دلیلیں ہیں جو خود انہیں کو قانع کر سکتی ہیں لیکن ایک انصاف پسند اور روشنفکر محقق کو وہی دلیل قانع کرے گی جو متفقہ اور مشترکہ روایات پر مبنی ہو کیونکہ وہ اجماع امت قرار پائے گی لہذا ہم نے اس مقالہ میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس سلسلہ میں شیعہ اور سنی متفقہ روایات کی روشنی میں گفتگو کریں تاکہ وہ دونوں کے لئے حجت ہوں ان سے برآمد ہونے والا نتیجہ ہی برحق ہوگا.

تحقیق سے قبل ان نکات کی طرف توجہ دینا ضروری ہے:

ا۔ اہل سنت اپنی روایات کے مطابق ''جماعت'' [5]، ''اکثریت'' [6] اور ''پیروان خلفاء راشدین'' [7] کو ناجی مانتے ہیں جبکہ شیعہ اپنی احادیث کی روشنی میں حضرت علی علیہ السلام کے شیعوں کو نجات یافتہ بتاتے ہیں [8]

---

[1] ۔ابن حنبل، مسند، ۱۴۱۹ق، ج ۳، ص ۱۴۵؛ ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، دار الفکر، ج ۲، ص ۳۶۴؛ علامہ مجلسی، بحار الانوار، ۱۴۰۴ق، ج ۲۸، ص ۴.

[2] ۔شہرستانی، الملل والنحل، ۱۳۶۴ش، ج ۱، ص ۱۹-۲۰

[3] ۔ازی، تبصرۃ العوام، ۱۳۶۴ش، ص ۱۹۴-۱۹۹

[4] ۔ رازی، تبصرۃ العوام، ۱۳۶۴ش، ص ۱۹۴-۱۹۹

[5] ۔ا بن ماجہ، سنن ابن ماجہ، ۱۴۳۰ق، ج ۵، ص ۱۲۸-۱۳۰

[6] ۔ا بن ماجہ، سنن ابن ماجہ، ۱۴۳۰ق، ج ۵، ص ۱۲۸-۱۳۰

[7] ۔ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، ۱۴۳۰ق، ج ۱، ص ۲۸-۲۹

[8] ۔ علامہ مجلسی، بحار الانوار، ۱۴۰۳ق، ج ۲۸، ص ۱۱

۲۔ جب ہم شیعہ اور سنی روایات کا جائزہ لیں گے تو جائزہ کے بعد دو ہی صورتیں ہونگی۔

✓ فریقین میں سے کسی ایک کے نظریہ کی تائید ہوگی: یعنی یا تو امت کی نجات جماعت، اکثریت اور خلفاء راشدین کی پیروی میں ہوگی یا پھر امت کی نجات حضرت علی علیہ السلام کے شیعوں کی ہوگی۔

✓ فریقین میں سے کسی کے بھی نظریہ کی تائید نہ ہوگی بلکہ امت کی نجات کسی اور چیز میں ہوگی خیر جو بھی ثابت ہو گا وہی فرقہ ناجیہ کی علامت قرار پائے گا جس کو قبول کرنا ہر صاحب تحقیق کا فریضہ ہوگا کیونکہ دونوں فرق کا ان روایات پر اتفاق ہے خاص طور پر برادران اہل سنت نے حضور ﷺ سے نقل بھی کیا ہے "**میری امت خطا پر جمع نہیں ہو سکتی**" لہٰذا مشترکہ روایات سے برآمد ہونے والے نتیجہ کو ٹھکرانا ایک صاحب تحقیق کے لئے صحیح نہیں ہے بلکہ روایات کی روشنی میں میں معین ہونے والا فرقہ ہی ناجیہ، بہشتی اور "کنتم خیر امۃ" مصداق ہوگا اور اسی کو خدا کی جانب اپنے مذہب کی تبلیغ اور ترویج کا حق ہوگا۔

اب ہم فریقین کی ان روایات کو ذکر کر رہے ہیں جن میں امت کی نجات کے اسباب ذکر ہوے ہیں

اختصار کے پیش نظر ہم یہاں صرف ۴ روایات کا ذکر کریں گے بقیہ روایات کو بعنون موید ذکر کریں گے۔

۱۔ حدیث ثقلین :

یہ وہ صحیح اور معتبر حدیث ہے جس کو دونوں فرقوں نے صحیح سند کے ساتھ اپنی اپنی کتب میں ذکر کیا ہے۔

اہل سنت کے بہت سے محدثین اور علماء جیسے مسلم، ابن حبان، احمد ابن حنبل بیہقی وغیرہ نے اپنی کتب میں اس حدیث کو نقل کیا ہے:

"زید بن ارقم سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ مکہ اور مدینہ کے درمیان غدیر خُم میں۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور وعظ و نصیحت کے بعد ہم سے فرمایا۔۔۔ **میں تمہارے درمیان دو عظیم چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، ایک اللہ کی کتاب** ۔۔ اور (دوسرے) **میرے اہل بیت ہیں** (پھر تین بار فرمایا) میں تمہیں اپنے اہل بیت کے متعلق اللہ کی یاد دلاتا ہوں"[۱]

امام نسائی نے سنن کبری میں اس طرح نقل کیا ہے "آپ ﷺ نے فرمایا "میری موت کا وقت قریب ہے۔ **میں تمہارے درمیان دو قیمتی چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، جن میں سے ایک دوسری سے بڑی ہے، کتاب خدا اور میری آل جو کہ میرے اہل بیتؑ ہیں** دیکھو تم ان دونوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہو یہ اس وقت تک (ایک دوسرے سے) جدا نہیں ہونگے جب تک کہ حوض کوثر کے کنارے میرے پاس نہ آئیں۔"[۲]

ابن ابی شیبہ، طبرانی اور احمد بن حنبل نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے میں **تمہارے درمیان دو کامل خلیفہ و جانشین چھوڑ کر جارہا ہوں، خداوند کی کتاب اور اپنی عترت (اہل بیت)**، اور حوض کوثر کے کنارے میرے پاس آنے تک، وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے [۳]

---

[۱] أخرجہ مسلم فی الصحیح، کتاب: فضائل الصحابۃ: من فضائل علی بن أبی طالب رضی اللہ عنہ، ۱۸۷۳/۳، الرقم: ۲۴۰۸، وأحمد بن حنبل فی المسند، ۳۶۶/۴، الرقم: ۱۹۲۶۵، والبیہقی فی السنن الکبری، ۱۴۸/۲، الرقم: ۲۶۷۹، وابن حبان فی الصحیح، ۱۴۵/۱، الرقم: ۱۲۳، واللالکائی فی اعتقاد أہل السنۃ، ۷۹/۱، الرقم: ۸۸، وابن کثیر فی تفسیر القرآن العظیم، ۴۸۷/۳

[۲] کأنی قد دعیت فاجبت، انی قد ترکت فیکم الثقلین احدہما اکبر من الآخر، کتاب اللہ وعترتی اہل بیتی، فانظروا کیف تخلفونی فیہما، فانہما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض. نسائی، السنن الکبری، ۱۴۱۱ق، ج۵، ص۴۵

[۳] حدثنا أبو داود عمر بن سعد، عن شریک، عن القاسم بن حسان، عن زید بن ثابت یرفعہ، قال:

انہیں الفاظ میں ناصر الدین البانی نے کچھ تفاوت کے ساتھ نقل کیا ہے [1] اہل سنت کی اور دوسری کتابوں میں بھی اس حدیث کا ذکر ہوا ہے [2]۔

اسی طرح شیعوں کی اصول کافی میں بھی یہ روایت منقول ہے

إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ إِنْ أَخَذْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوا- كِتَابَ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ أَهْلَ بَيْتِي عِتْرَتِي أَيُّهَا النَّاسُ اسْمَعُوا وَ قَدْ بَلَّغْتُ إِنَّكُمْ سَتَرِدُونَ عَلَيَّ الْحَوْضَ فَأَسْأَلُكُمْ عَمَّا فَعَلْتُمْ فِي الثَّقَلَيْنِ كِتَابُ اللَّهِ جَلَّ ذِكْرُهُ وَ أَهْلُ بَيْتِي [3]...۔ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم ان سے متمسک رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے: (ایک) کتاب خدا اور (دوسرے) میرے اہل بیت جو میری عترت ہیں اے لوگو سنو! میں نے تم سے بتلادیا ہے کہ تم مجھ سے حوض کوثر پر ملو گے، میں تم سے ان دو قیمتی چیزوں کے بارے میں پوچھوں گا کہ تم نے ان کے ساتھ کیا برتاو کیا۔ [4]

۲۔ حدیث امان

اہل سنت کی عظیم شخصیت حاکم نیشاپوری نے اس روایت کو "مستدرک الصحیحین" میں ابن عباس سے نقل کیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا «النُّجُومُ أَمَانٌ لِأَهْلِ الْأَرْضِ مِنَ الْغَرَقِ، وَ أَهْلُ بَيْتِي أَمَانٌ لِأُمَّتِي مِنَ الِاخْتِلَافِ، فَإِذَا خَالَفَتْهَا قَبِيلَةٌ مِنَ الْعَرَبِ اخْتَلَفُوا فَصَارُوا حِزْبَ إِبْلِيسَ [5]

ستارے زمین والوں کو غرق ہونے سے محفوظ رکھنے کا وسیلہ ہیں میرے اہل بیتؑ میری امت کو تفرقہ سے محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہیں پس جو گروہ ان کی مخالفت کرے گا تو وہ بدکار اور ابلیس کا گروہ قرار پائے گا" اس کی اسناد صحیح بخاری اور مسلم کی اسناد ہیں۔ اسی طرح شیعوں کے بڑے محدثین صدوقؒ اور طوسیؒ نے حضور ﷺ سے نقل کیا ہے۔

«إِنِّي تَرَكْتُ فِيكُمُ الْخَلِيفَتَيْنِ كَامِلَتَيْنِ: كِتَابَ اللهِ، وَعِتْرَتِي، وَإِنَّهُمَا لَنْ يَتَفَرَّقَا حَتَّى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ» ابن أبي شيبة الكوفي، ابو بكر عبد الله بن محمد (متوفاى ۲۳۵ھ)، مسند ابن أبي شيبة، ج۱، ص۱۰۸، ح۱۳۵، تحقیق: عادل بن يوسف العزازي و أحمد بن فريد المزيدي، ناشر: دار الوطن - الرياض، الطبعة: الأولى، ۱۹۹۷م؛ وابن أبي شيبة الكوفي، ابو بكر عبد الله بن محمد (متوفاى ۲۳۵ھ)، الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار، ج۶، ص۳۰۹، ح۳۱۶۷۹، تحقیق: كمال يوسف الحوت، ناشر: مكتبة الرشد - الرياض، الطبعة: الأولى، ۱۴۰۹ھ؛ والطبراني، ابوالقاسم سليمان بن أحمد بن أيوب (متوفاى ۳۶۰ھ)، المعجم الكبير، ج۵، ص۱۵۳، ح۴۹۲۱؛ ج ۵، ص ۱۵۴، ح۴۹۲۲، تحقیق: حمدي بن عبد المجيد السلفي، ناشر: مكتبة الزهراء - الموصل، الطبعة: الثانية، ۱۴۰۴ھ - ۱۹۸۳م؛ الشيباني، ابوعبد الله أحمد بن حنبل (متوفاى ۲۴۱ھ)، فضائل الصحابة، ج۲، ص۶۰۳، ح۱۰۳۲؛ ج۲، ص۷۸۶، ح۱۴۰۳، تحقیق د. وصي الله محمد عباس، ناشر: مؤسسة الرسالة - بيروت، الطبعة: الأولى، ۱۴۰۳ھ - ۱۹۸۳م؛

[1] ۲۴۵۷. إني تارک فيکم خليفتين: کتاب الله حبل ممدود ما بين السماء و الأرض و عترتي أهل بيتي و إنهما لن يتفرقا حتى يردا علي الحوض (حم طب) عن زيد بن ثابت ألباني، محمد ناصر الدين (متوفاى ۱۴۲۰ھ)، صحيح جامع الصغير و زيادته، ج۱، ص ۴۸۲، ح ۲۴۵۷، ناشر: المكتب الإسلامي

[2] طبرانی، المعجم الکبیر، ۱۴۰۴ق، ج۵، ص۱۸۶۔ ترمذی، سنن الترمذی، ۱۴۰۱ق، ح ۳۸۷۶۔ حاکم نیشاپوری، المستدرک، دار المعرفہ، ج۳، ص۱۱۰۔ احمد بن حنبل، مسند احمد، قاہرہ، ج۴، ص ۳۷۱

[3] کلینی، الکافی، دار الکتب الاسلامیہ، ج۱، ص ۲۹۴

[4] ممکن ہے بعض کے ذہن میں یہ روایت آئے کہ آپ نے فرمایا "کتاب اللہ و سنتی" تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت کو شیعہ نہیں مانتے اور ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ اس حدیث کو پیش کریں گے جس کو سب مانتے ہوں اس علاوہ شیعوں اس روایت کی رد میں یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اگر حضور نے "سنتی" کہا تھا تو پھر حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ کیوں اور قرآن کی طرح احادیث کو کیوں جمع نہ کیا بلکہ ان ۹۰ سال بین کیوں رہا خلیفہ اول نے ذرا سے شک پر ۵۰۰ احادیث کو کیوں نظر آتش کر دیا یہ روایت بہت سی مشکلات سے روبرو ہو گی

[5] ۔ نیشابوری، محمد بن عبد اللہ، المستدرک علی الصحیحین، تحقیق: عطا، مصطفیٰ عبد القادر، ج ۳، ص ۱۶۲، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، چاپ اول، ۱۴۱۱ق؛ صالحی شامی، محمد بن یوسف، سبل الهدی و الرشاد فی سیرة خیر العباد، ج۱۱، ص ۷، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، چاپ اول، ۱۴۱۴ق.

النُّجُومُ أَمَانٌ لِأَهْلِ السَّمَاءِ فَإِذَا ذَهَبَتِ النُّجُومُ ذَهَبَ أَهْلُ السَّمَاءِ وَ أَهْلُ بَيْتِي أَمَانٌ لِأَهْلِ الْأَرْضِ فَإِذَا ذَهَبَ أَهْلُ بَيْتِي ذَهَبَ أَهْلُ الْأَرْضِ ستارے اہل آسمان کی سلامتی ہیں اور جب وہ ختم ہو جائیں گے تو اہل آسمان نابود ہو جائیں گے۔ میرے اہل بیت اہل زمین کے لئے امان ہیں جب وہ دنیا سے چلے جائیں گے تو اہل زمین بھی نابود ہو جائیں گے

۳۔ حدیث حطہ

اس حدیث کو ابن حجر، ہیثمی، سیوطی مناوی طبرانی وغیرہ نے ابو سعید خدری سے انھوں نے حضور ﷺ سے نقل کیا ہے:

"تم میں اہل بیتؑ کی مثال اسرائیل کے باب الحطہ کی سی ہے جو اس میں داخل ہوگا اسے بخش دیا جائے گا"[۲]۔

اس طرح شیعوں میں صدوقؒ نے اپنی کتاب امالی میں حضور ﷺ سے نقل کیا ہے[۳]۔

۴۔ **حدیث سفینہ:**

اہل سنت میں طبرانی[۴]، ابن اثیر[۵] اور حاکم نیشاپوری جیسے علماء نے اس حدیث کو نقل کیا ہے حاکم نیشاپوری نے اپنی سند کے ساتھ حنش کنانی سے نقل کیا ہے کہ ابوذرؓ خانہ کعبہ کے دروازے کے پاس کھڑے ہوئے کہہ رہے تھے:

ایها الناس ! من عرفنی فانا من عرفتم، و من انکرنی فانا ابوذر، سمعت رسول الله (صلی الله علیه و آله) یقول": مثل اهل بیتی مثل سفینه نوح، من رکبها نجی و من تخلف عنها غرق"۔[۶]

اے لوگو! جو مجھے پہچانتا ہے وہ پہچانتا ہے اور جو نہیں پہچانتا ہے تو میں ابوذر ہوں، میں نے رسول خدا (صلی اللہ علیہ و آلہ) سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: تمہارے درمیان میرے اہل بیتؑ کی مثال ویسی ہے جیسے کشتی نوح کی تھی، جو بھی اس پر سوار ہوا نجات پاگیا اور جو جس نے روگردانی کی وہ غرق ہوگیا۔ **شیعہ منابع میں بھی یہ روایت موجود ہے**

نتیجہ:

مذکورہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضور نے صحابہ اور قیامت تک آنے والی اپنی امت کو انحراف اور ضلالت سے بچانے کے لئے ان کے درمیان "قرآن اور اہل بیتؑ" کو چھوڑا جن کو مسلم اور ابن حبان کی روایت کے مطابق "ثقلین" دو گرانقدر اور ابن ابی شیبہ، طبرانی اور احمد بن حنبل کے مطابق "دو کامل خلیفہ" قرار دیا ہے جو قیامت تک ایک دوسرے جدا نہ ہونگے دیگر روایات میں اپنے اہل بیتؑ کو "کشتی نوح" "باب حطہ" زمین والوں کے امان قرار دیا ان سے مخالفت کرنے والوں کو شیطانی گروہ قرار دیا۔

---

[۱] ابن بابویہ (صدوق)، محمد بن علی، کمال الدین و تمام النعمۃ، ج۱، ص۲۰۵، تہران، اسلامیہ، چاپ دوم، ۱۳۹۵ق؛ طوسی، محمد بن الحسن، الامالی، ص۳۷۹، قم، دار الثقافۃ، چاپ اول، ۱۴۱۴ق.

[۲] تیمی، الصواعق المحرقۃ، ۱۳۸۷ق، ج۵، ص۱۷۹؛ سیوطی و مناوی، جامع الاحادیث، ۱۴۱۴ق، ج۸، ح۸۹۵۶؛ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۱۴۱۴ق، ج۹، ص۱۶۸؛ طبرانی، المعجم الصغیر، ۱۴۰۵ق، ج۲، ص۸۲.

[۳] صدوق، الامالی، ۱۳۷۶ش، ص۷۴، ح۶

[۴] المعجم الصغیر، ج۱، ص۱۳۹۔ (مثل اهل بیتی فیکم کمثل سفینۃ نوح فی قوم نوح، من رکبها و نجی و من تخلف عنها هلک و مثل باب حطۃ فی بنی اسرائیل)

[۵] نہایۃ ابن اثیر، مادہ زرخ۔ ("مثل اهل بیتی مثل سفینۃ نوح، من تخلف عنها زرخ به فی النار")

[۶] مستدرک حاکم، ج۲، ص۳۴۳۔

کل ملاکر ان شیعہ اور اہل سنت کی مشترکہ و متفقہ احادیث کا نچوڑ یہی ہوا کہ ہے امت کی نجات قرآن اور اہل بیتؑ رسول سے تمسک میں ہے یہ دونوں ہی امت کے فرقہ فرقہ ہونے سے بچنے کا سبب ہیں ان سے متمسک رہنے والا فرقہ ہی ناجی ہے روایات کے اس مفہوم پر امت کا اتفاق ہے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہل بیت رسول ﷺ کون ہیں؟

تو ان روایات ہی میں غور و فکر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ حضور کی مراد آپ کے وہ اہل بیت خاص ہیں کہ جو قیامت تک قرآن کے ساتھ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں نہ وہ افراد جو ایک زمانہ سے محدود ہوں اسی لئے ازواج مطہرات کو شامل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ سب پہلی صدی ہی میں دنیا سے رخصت ہوگئیں شاید اسی لئے حضور ﷺ نے عترتی واہل بیتی کہا یعنی میرے وہ اہل بیت کہ جو میری عترت ہیں کیونکہ آپ ﷺ کی عترت قیامت تک باقی رہے گی جس میں کسی بھی مسلمان کو شک نہیں ہے اور ہماری اس بات کی گواہ کہ اہل بیت سے مراد ازواج نہیں ہیں مسلم کی حسب ذیل روایت ہے

جب زید بن ارقم نے واقعہ غدیر کو سنایا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم میں دو چیزیں قرآن اور اہل بیت چھوڑ کر جارہا ہوں اور پھر تین مرتبہ فرمایا خدارا تم کو اپنے اہل بیت کی تاکید کرتا ہوں، تو حاضرین نے زید سے سوال کیا اہل بیت پیامبر ﷺ کون ہیں؟ کیا ان کی بیویاں بھی اہل بیت میں ہیں؟ انھوں نے کہا ''نہیں، اللہ کی قسم! عورت اپنے مرد کے ساتھ زمانے کا بڑا حصہ رہتی ہے، پھر وہ اسے طلاق دے دیتا ہے تو وہ اپنے باپ اور اپنی قوم کی طرف واپس چلی جاتی ہے۔ آپ ﷺ کے بعد آپ کے اہل بیت وہ ہیں جو آپ کے خاندان سے ہیں، آپ کے وہ ددھیال رشتہ دار جن پر صدقہ حرام ہے.... لَا، وَايْمُ اللهِ إِنَّ الْمَرْأَةَ تَكُونُ مَعَ الرَّجُلِ الْعَصْرَ مِنَ الدَّهْرِ، ثُمَّ يُطَلِّقُهَا فَتَرْجِعُ إِلَى أَبِيهَا وَقَوْمِهَا أَهْلُ بَيْتِهِ أَصْلُهُ، وَعَصَبَتُهُ الَّذِينَ حُرِمُوا الصَّدَقَةَ بَعْدَهُ''[1] اس سے پتہ چلتا ہے کہ جن اہل بیت کی تین بار صحابہ کو سفارش کی اور ان کو قرآن کا ساتھی قرار دیا وہ ازواج نہیں ہیں

ہاں اگر حضور ﷺ نے استثنائی طور اپنی ازواج کے بارے میں فرمایا ہو تاکہ میری ازواج قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن ان کے ساتھ ہیں یہ دونوں قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونگے تو چاہے وہ پہلی صدی ہی میں فوت ہوگئیں تھیں پھر بھی ہم مانتے اور اسکی بہترین تاویل و توجیہ کرتے جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں وارد ہوا ہے جس کو اہل سنت کے بڑے عالم حاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب المستدرک میں نقل کیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا: **علی مع القرآن والقرآن مع علی لن یفترقا حتی یردا علی الحوض**[2] علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہونگے یہاں تک حوض کوثر پر میرے پاس وارد ہوں اگرچہ امیر المومنین سن ۴۰ ہجری میں شہید ہوگئے لیکن قیامت تک ان کے قرآن کے ساتھ رہنے کا مطلب وہی ہے جو حضور ﷺ کے قیامت تک اسلام و قرآن کے ساتھ رہنے کا مطلب ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی سیرت قرآن کے ساتھ اور قرآن

---

[1] صحیح مسلم حدیث ۶۲۲۸

[2] حاکم نیشاپوری المستدرک علی الصحیحین ج ۳ ص ۱۳۴

حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ ہے حضور کے بعد حضرت علیؑ کی سیرت ہی آپ ﷺ کی واقعی سیرت کی بیانگر ہے ورنہ مسلمان تو حضور ﷺ کی اس وضو اور نماز کے طریقہ ہی میں اختلاف رکھتے ہیں جس کو حضور ﷺ نے چند ہزار کر کے صحابہ کو دکھایا اور کہا "نماز ایسے پڑھو جیسے میں پڑھتا ہوں" حضور ﷺ کے ۲۵ سال بعد جب حضرت علی علیہ السلام نے بصرہ میں نماز پڑھائی تو پیچھے نماز پڑھنے والوں نے کہا کہ آج علیؑ نے پیغمبر کی نماز یاد دلادی وہ بھی ایسے ہی نماز پڑھتے اسی لئے حضور ﷺ نے اپنے بعد اہل بیت جن میں حضرت علی علیہ السلام سر فہرست ہیں قرآن کے ساتھ چھوڑے تاکہ آپ کی حقیقی سیرت کو اور قرآن کی تفسیر کو بیان کر سکیں

البتہ یہ بھی یاد رہے جن اہل بیت کو حضور ﷺ نے قرآن کے ساتھ چھوڑا اور ان کی سفارش کی اس سے مراد آپ ﷺ کا تمام خاندان یا آپ کے وہ ددھیال رشتہ دار نہیں ہیں جن پر صدقہ حرام ہے جیسا کہ زید ابن ارقمؓ کا نظریہ ہے بلکہ اس سے مراد حضور ﷺ کے زمانہ میں وہ افراد ہیں جن پر چادر ڈال کر کہا: "اللھم ھولاء اھلبیتی "خدایا یہ میرے اہل بیت ہیں جن کو آپ مباہلہ میں لے گئے ان پر شیعہ اور سنی کا اتفاق ہے کہ وہ افراد علی و فاطمہ و حسن اور حسین علیہم السلام ہیں کیونکہ ان کے علاوہ آپ کے اہل بیت میں کوئی نہ تھا جو قرآن کا ساتھی قرار پاتا اس لئے کہ ان ہی حضرات میں یہ خصوصیت پائی جاتی تھی کیونکہ حضور ﷺ نے، امام حسن اور امام حسین علیہم السلام کو اہل بہشت کا سردار بتایا ہے اور فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو جنت کی عورتوں کی سردار قرار دیا ہے اس لئے اگر امت ان سے تمسک کرے گی تو وہ ان کو بہشت کی طرف راہنمائی کریں گے اور ان کی گمراہی سے نجات کا سبب بنیں گے اس کے علاوہ حضور ﷺ کا ان کے بارے میں یہ بیان، خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ معصوم ہیں کیونکہ خدا کیسے غیر معصوم کو کہ جس سے دنیا میں خطا کا امکان ہے اپنی جنت کی سرداری دے سکتا ہے لہذا معلوم ہوا کہ پیغمبر ﷺ کا ہر خاندانی یا ددھیالی رشتہ دار قیامت تک قرآن کا ساتھی، ہم پلہ اور مفسر و مبین واقعی قرار نہیں پاسکتا بلکہ ان کی نسل سے وہ افراد مقصود ہیں کہ جو مکمل طور پر معصوم ہوں اور قرآن کے عالم ہوں، اور صرف عالم ہی نہیں بلکہ قرآن ان کی گھٹی میں ملا ہو، ان کا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا رفتار و کردار سب قرانی ہو جیسا کہ حضور کا اخلاق قرآنی تھا ان کا اخلاق بھی قرآنی ہو اور رسول خدا کے قول و فعل کی طرح ان کے قول و فعل کی ضمانت خدا نے لی ہو "وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللهَ رَمٰى "ان کی ولایت رسول خدا کی ولایت کی طرح ہو إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ[1] انکی اطاعت رسول خدا کی اطاعت کی طرح ہو "أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الأَمْرِ مِنكُمْ"[2] آپ ﷺ کے اہل بیت میں سے وہی افراد قرآن کے ہم پلہ اور امت کے لئے باعث نجات قرار پاسکتے ہیں جو ان صفات کے مالک ہوں نہ ہر خاندانی اور دودھیالی رشتہ دار اور ان صفات کے مالک حضور کے زمانہ میں صرف علی و فاطمہ اور حسن و حسین علیہم السلام تھے جس کا تذکرہ آپ ﷺ نے بارہا اشارۃ کنایتاً بلکہ نام لے کر اپنی احادیث مبارکہ میں کیا ہے، اگر ان حضرات کے بارے میں جنت کی سرداری والی حدیث کے علاوہ کوئی بھی حدیث نہ ہوتی تو بھی ہمارے لئے کافی تھا کیوں کہ اس سے ان کے تمام فضائل ثابت ہو جاتے ہیں جس طرح ہمارے پیغمبر ﷺ

---

[1] مائدہ ۵۵

[2] نساء ۵۹

میں سید الرسل ہونے کی بنا پر نبیوں کی تمام خوبیاں جمع ہیں اسی طرح ان کے اہل بیت میں اہل بہشت کی تمام خوبیاں ہیں تبھی تو خدا نے انہیں بہشت کا سردار قرار دیا کہ جہاں تقوا معیار ہے ایک روایت میں آپ ﷺ نے حضرت علی اور خود کو بھی جنت کا سردار بتایا اس کے علاوہ علی، فاطمہ حسن و حسین علیہم السلام لئے فرمایا یہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں نیز فرمایا: علی فاطمہ و حسن و حسین سے جنگ مجھ سے جنگ ہے یعنی یہ ان میں اور مجھ میں نبوت کے سوا کوئی فرق نہیں ہے نیز فرمایا: علی میرے علم کا دروازہ، علیؑ کی محبت ایمان اور بغض نفاق ہے علی میرے بعد ہر مومن و مومنہ کے ولی ہیں اور ایک جگہ صریحا فرمایا: علی قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علی کے ساتھ اس اور یہ دونوں حوض کوثر پر میرے پاس وارد ہونے تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہونگے[1] یہ روایت مستدرک حاکم کی جس کے راوی مسلم اور بخاری کے ہیں لہذا یہ بھی فریقین کے نزدیک مسلم ہے اس حدیث سے حضور ﷺ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو اختلاف سے بچنا ہے تو میرے فورا بعد علی کو اپنا ولی مان لو وہ تم کو قرآن کے ساتھ لے کر چلیں گے وہی تم کو گمراہی سے نجات دیں گے ان کے بعد میرے نواسہ جو جنت کے سردار ہیں وہ تم کو قرآن کے مطابق ہدایت کریں گے امام حسینؑ کے بعد ان کی نسل سے نو ذوات مقدسہ ہیں جو آپ کی عترت ہیں جن کو آپ نے قرآن کے ساتھ اور لوگوں کا امام و حجت قرار دیا جیسا کہ مندرجہ ذیل روایت سے ثابت ہے

سید علی ہمدانی نے اپنی کتاب "مودۃ اہل البیت القربی" میں سلمان فارسیؓ سے روایت کی ہے "میں رسول خدا ﷺ کی خدمت میں گیا کیا دیکھتا ہوں کہ حسینؑ آپ ﷺ کے زانو پر بیٹھے ہیں اور آپ ﷺ ان کی آنکھوں اور منہ کو چوم رہے ہیں اور فرماتے ہیں: انك سيد ابو سادة انك امام ابن امام انك حجة ابن حجة ابو حجج تسعة من صلبك تاسعهم قائمهم تو سید ہے اور سید کا بیٹا ہے تو امام ہے اور امام کا بیٹا ہے تو حجت ہے اور حجت کا بیٹا ہے اور نو حجتوں کا باپ ہے نواں ان کا قائم (امام مہدیؑ) ہے[2] اس کی تائید یہ شیعہ روایت بھی کرتی ہے جس کو کلینی نے اصول کافی میں حضرت علی علیہ السلام سے نقل کیا ہے:... إن الله تبارك وتعالى طهرنا وعصمنا وجعلنا شهداء على خلقه وحجته في أرضه،وجعلنا مع القرآن وجعل القرآن معنا لا نفارقه ولا يفارقنا. [3] بے شک اللہ تبارک و تعالی نے ہم کو پاکیزہ و معصوم قرار دیا ہے اور اپنی مخلوق پر ہم کو گواہ بنایا اور اپنی زمین پر ہم کو حجت قرار دیا اللہ ہی نے ہم کو قرآن کے ساتھ قرار دیا اور قرآن کو ہمارے ساتھ قرار دیا ہے نہ ہم اس سے جدا ہونگے اور نہ وہ ہم سے جدا ہوگا

لہذا فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے سوا بارہ امام ہیں جن کو حضور نے قرآن کے ہمراہ قیامت تک قرار دیا جو آپ کے اوصیاء برحق، خلیفہ کامل ہیں جن کا عمل قرانی ہے جن کی تعداد شیعہ کتابوں کے علاوہ بخاری اور مسلم کی روایات سے واضح ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

---

[1] حاکم نیشاپوری المستدرک علی الصحیحین ج ۳ ص ۱۳۴

[2] خوارزمی مقتل الحسین ج ۱ ص ۱۲۶ مکتبہ مفید قم

[3] الکافی: ج ۱ ص ۱۹۱

''جابر بن سمرہ سے روایت ہے میں اپنے باپ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا میں نے سنا آپ فرماتے تھے یہ خلافت تمام نہ ہوگی جب تک مسلمانوں میں بارہ خلیفہ نہ ہولیں پھر آپ نے آہستہ سے کچھ فرمایا میں نے باپ سے پوچھا کیا فرمایا انہوں نے کہا آپ نے یہ فرمایا یہ سب قریش سے ہوں گے''اسی سے مشابہ اور دیگر روایات ہیں ان میں ایک یہ بھی مسلم کی روایت ہے۔

''۔۔یہ دین ہمیشہ غالب اور مضبوط رہے گا بارہ خلیفوں کی خلافت تک پھر آپ نے کچھ ارشاد فرمایا **جو لوگوں نے مجھے سننے نہ دیا میں** نے باپ سے پوچھا آپ نے کیا فرمایا انہوں نے کہا آپ ﷺ نے وہ فرمایا کہ سب قریش میں سے ہونگے''

اس مضمون کی دو روایت بخاری ۵ مسلم کی کتاب الامارۃ اور دیگر بڑی کتب میں ہیں جن کا یہ نتیجہ نکلتا ہے ۔

۱۔ رسول خدا ﷺ کے خلفاء کی تعداد بارہ ہے۔

۲۔ آپ ﷺ کی خلافت قیامت تک باقی رہے گی۔

۳۔ آپ کے تمام خلفاء خاندان قریش سے ہونگے۔

۴۔ لوگوں نے شور مچادیا سنے نہ دیا (حدیث قرطاس میں بھی اتنا نزاع ہوا کہ حضور ﷺ نے فرمایا میرے پاس سے اُٹھ جاو)

اب سوال ہے کہ جب عدد بتایا تو کیا نام نہیں بتائیں ہونگے جبکہ آپ ﷺ ان کو قیامت تک قرآن کے ساتھ بعنوان ھادی اور ناجی امت چھوڑ کر جارہے ہیں حتما بتایا ہوگا ہم نے اسی یقین کی بنا پر جب تلاش کیا تو ہمارے پیارے نبی کی وہ حدیث جس میں آپ نے اپنے بارہ خلفاء و اوصیاء کے نام کا ذکر کیا ہے خدا کے فضل و کرم سے اہل سنت ہی کی عظیم شخصیت، علامہ ذہبی کے استاد علامہ جوینی کی کتاب ''فرائد السمطین''میں نظر آگئی جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ نہ صرف مسلمانوں کو بتایا بلکہ بعض انصاف پسند حق یہودیوں نے بھی حضرت سے آپ ﷺ کے بعد آنے والے خلفاء کے نام پوچھے بس فرق اتنا ہے حضور ﷺ نے جب مسلمانوں کو قیامت تک گمراہی سے بچانے کے لئے قلم و دوات مانگا تو پاس بیٹھنے والوں نے ''حسبنا کتاب اللہ'' کہہ کر شور مچایا جس پر آپ نے ان کو اپنی بزم سے اٹھادیا[1] یا جب آپ نے اپنے خلفاء کی تعداد کا ذکر کیا تو بھی لوگوں نے شور مچایا جس نے سمرہ کے بیٹے کو سننے نہ دیا لیکن یہودی نے حضور ﷺ سے سوال کیا اور غور سے سن کر کلمہ پڑھ لیا آیئے اب حدیث کو نقل کرتے ہیں:

علامہ جوینی اپنی کتاب فرائد السمطین میں مجاہد کی سند سے ابن عباس رضی اللہ سے (بارہ اماموں) کے نام نقل کرتے ہیں

''نعثل'' نام کا ایک یہودی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا اے محمد ﷺ میں تم سے چند چیزوں کے بارے میں سوال کروں گا جو ایک مدت سے میرے سینے میں جوش مار رہی ہیں اگر آپ نے ان کا جواب دیدیا تو میں آپ کے ہاتھوں پر اسلام لے آؤں گا

آپ ﷺ نے فرمایا اے **ابو عمارہ** سوال کرو اس نے کہا اے محمد ﷺ آپ مجھ سے اپنے پروردگار کے صفات بیان کیجئے۔

---

[1] ۔قرآن کریم فرماتا ہے نبی کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو ورنہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں گے

آپ ﷺ نے فرمایا اس کی توصیف نہیں کی جاسکتی مگر انہیں صفات (یعنی الفاظ اور کلمات) سے جس سے خود اس نے اپنی توصیف کی ہے اور خالق کی صفات کو کیسے بیان کیا جاسکتا ہے جبکہ اس کو سمجھنے سے عقل عاجز ہیں اور اوہام کی اس تک رسائی ممکن نہیں، خیالات اس کو درک کرنے سے قاصر ہیں، آنکھیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتی خدا کی ذات ہر توصیف کرنے والے کی توصیف سے بلند و برتر ہے وہ اپنی نزدیکی میں بھی دور اور اپنی دوری میں بھی نزدیک ہے (یعنی دور ہوتے ہوئے بھی نزدیک اور نزدیک ہوتے ہوئے بھی دور ہے) وہ کیف الکیف اور این الاین ہے اس کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کہاں ہے کیسا ہے کیونکہ وہ کیفیت[1] اور اینیت[2] سے پاک و پاکیزہ ہے وہ احد (یکتا) وصمد (بے نیاز) ہے جیسا کہ خود اس نے اپنی تعریف بیان کی ہے صفت بیان کرنے والے تو اس کی توصیف کر ہی نہیں سکتے کیونکہ وہ **لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ**"[3] ہے

اس یہودی نے کہا اے محمد آپ نے سچ فرمایا لیکن مجھ سے اپنے اس قول کی وضاحت کیجئے "وہ ایک ہے کوئی اسکے جیسا نہیں ہے" کیا اللہ ایک نہیں ہے اور کیا (گنتی کے اعتبار سے) انسان بھی ایک نہیں ہے؟ پھر دونوں کے ایک ہونے میں کیا فرق ہے؟

آپ نے کہا اللہ جل شانہٗ کی وحدانیت " احدی المعنی" ہے یعنی وہ ایسا ایک ہے کہ جس کا کوئی جز نہیں ہے اور نہ کسی چیز سے مل کر بنا ہے جبکہ انسان کی وحدانیت "ثنائی المعنی" ہے یعنی وہ ایسا ایک ہے جو روح اور بدن سے مل کر بنا ہے؟

یہودی نے کہا: آپ نے سچ فرمایا

لیکن اب مجھ کو بتائے کہ **آپ کا وصی کون ہے**؟ کیونکہ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے جیسے ہمارے نبی موسیٰؑ بن عمران نے اپنا وصی یوشعؑ بن نون کو بنایا تھا۔

آپ نے فرمایا میرے وصی علیؑ بن ابی طالبؑ ہیں اور ان کے بعد میرے دونوں نواسے حسن اور حسین ہیں اس کے بعد نو آئمہ حسین کے صلب سے ہیں۔

یہودی نے کہا: اے محمد ﷺ مجھ سے ان (نو آئمہ) کے نام بتائیے آپ نے فرمایا جب حسین اس دنیا سے چلے جائیں گے تو ان کے بیٹے علی ہونگے پھر ان کے بیٹے محمد پھر ان کے بیٹے جعفر پھر ان کے بیٹے موسیٰ پھر ان کے بیٹے علی پھر ان کے بیٹے محمد پھر ان کے بیٹے علی پھر ان کے بیٹے حسن اور جب حسن بھی اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے تو ان کے بیٹے محمد مہدی ہونگے یہ بارہ ۱۲ ہیں

یہودی نے کہا: مجھے علی حسن اور حسین کی وفات کی کیفیت کے بارے میں بتلائے؟

آپ نے فرمایا علی کو ان کے سر پر ضربت مار کر شہید کیا جاے گا، اور حسن کو زہر سے شہید کیا جائے گا اور حسین کو ذبح کیا جائے گا۔

یہودی نے کہا کہ انکا مقام کہاں پر ہے؟

آپ نے فرمایا یہ لوگ جنت میں میرے ہم درجہ ہونگے

---

[1] یعنی کیسا ہے

[2] یعنی کہاں ہے

[3] اخلاص ۳،۴

یہودی نے کہا: اشهد ان لا اله الا الله وانك رسول الله اشهد انهم الاوصياء بعدك۔ میں گواہی دیتا ہوں خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور آپ اللہ کے رسول ہیں اور یہ حضرات آپ کے بعد وصی ہیں میں نے گزشتہ انبیاء کی کتب میں یہی دیکھا ہے اور اسی چیز کی خبر ہم سے موسیٰ بن عمران نے دی تھی کہ آخری زمانہ میں ایک نبی ظہور کرے گا جس کو احمد اور محمد کے نام سے پکاریں گے وہ خاتم الانبیاء ہونگے ان کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا بلکہ ان کے بعد اس کے بارہ وصی ہونگے جن میں پہلا ان کا چچازاد بھائی اور ان کا داماد ہوگا اور دوسرے اور تیسرے وصی دو بھائی ہوں گے جو اسی کی اولاد میں ہونگے [1]

اب معلوم ہوا کہ بعض افراد نے عدد والی حدیث نقل کرنے کے بعد اس حدیث کو کیوں نقل نہ کیا کیوں کہ اس حدیث کا نقل کرنا ان کے مذہب کے بطلان کی دلیل تھی لہذا اس کو نقل کرنے سے گریز کیا لیکن خداوند متعال اہل حق کو کبھی بغیر واضح دلیل کے نہیں چھوڑتا۔

علامہ جوینی کی مذکورہ حدیث کے علاوہ شیعوں کی متعدد روایات سے پتہ چلتا ہے حضور کے یہ بارہ جانشین یکے بعد دیگرے قرآن کے ساتھ امت کے لئے وسیلہ نجات ہیں اور یہ ہی قیامت تک خلیفہ کامل ہیں آج بھی ان کے نام مسجد نبوی دیواروں کی زینت ہے جنکی آخری فرد امام مھدی علیہ السلام کے ہاتھوں دین اسلام دنیا پر غالب آے گا جو پوری دنیا میں اسلام کو حاکم کریں گے جس کے لئے خدا نے اپنے حضور ﷺ کو بھیجا تھا:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ [2]

مگر آپ ﷺ کے زمانہ میں پوری دنیا پر دین اسلام غالب نہ آسکا بلکہ یہ امر آپ ﷺ کے آخری وصی امام مھدی علیہ السلام کے ذریعہ محقق ہوگا جس پر شیعہ سنی دونوں کا اتفاق ہے نیز اس پر بھی اتفاق ہے کہ وہ آپ ﷺ کے آخری خلیفہ اور آپ ﷺ کی عترت ہیں اور ان کی حکومت قرانی ہوگی اور یہ بات ظاہر ہے کہ قرانی حکومت وہی قائم کرسکتا ہے جو عملا قرآن کے ساتھ ہو اور قرآن اس کے ساتھ ہو یعنی رسول خدا کا "خلیفہ کامل" ہو جیسا ابن ابی شیبہ، طبرانی اور احمد بن حنبل والی روایت میں ہے "تمہارے درمیان دو کامل خلیفہ (قرآن اور اہل بیتؑ) چھوڑ کر جارہا ہوں"

امام مھدی علیہ السلام کے ذریعہ اسلام کو ایسی عزت اور سربلندی نصیب ہوگی کہ اس سے قبل کبھی نہیں ہوئی کیونکہ دنیا کے چپہ چپہ پر اسلام کا پرچم لہرائے گا

البتہ یہ بھی یاد رہے کہ اسلام کی سربلندی تلوار کے زور پر کلمہ پڑھوا دینے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اپنے اخلاق حسنہ اور اخلاق نبوی کو پیش کرکے عطوفت و مہربانی کے سایہ میں منطقی دلائل کے بلبوتے پر دین کو قرآن کے مطابق صحیح طور پر پیش کرکے کلمہ پڑھوا دینے سے حاصل ہوتی ہے یہ بھی نکتہ ذہن نشین رہے کہ امام مھدی علیہ السلام کی اتنی بڑی کامیابی حضور ﷺ کی زحمتوں کاوشوں اور ان گیارہ جانشینوں کی مظلومیت اور قربانی کا نتیجہ ہوگی کہ جنھوں نے امام مھدیؑ کے ظہور کی امید پر اپنے اصحاب کی تربیت کی اور ہر دور میں ان کے

---

[1]. جوینی، فرائد السمطین ج ۲ ص ۱۳۴ چاپ موسسہ المحمودی بیروت لبنان

[2] سورہ توبہ ۳۳

دلوں میں امید قائم کی اور ان کے ذہنوں میں اس بات کو اجاگر کیا کہ بہترین عبادت انتظار امام مھدی علیہ السلام اور اپنے کو ان کی فداکاری لئے آمادہ کرنا ہے

نتیجہ

تمام شیعہ اور سنی روایات کو ایک جگہ جمع کرنے سے پتہ چلتا ہے نجات قرآن اور اہل بیتؑ سے تمسک میں ہے کیونکہ اللہ نے ان کو عدل قرآن قرار دیا اہل بیت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں حضرت علی و فاطمہ حسن اور حسین علیہم السلام اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نو ذوات مقدسہ امام حسین کی نسل ہیں جو بالترتیب یکے بعد دیگرے قیامت تک امت کے امام ہیں جنکی بشارت آپ نے پہلے ہی دیدی تھی ان میں آخری امام مھدی علیہ السلام ہیں وہی اپنی جہانی حکومت سے ہدف بعثت رسول خدا کو عملی جامہ پہنائیں گے

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ[۱]

ان حضرات کی اطاعت اور ولایت، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور ولایت ہے اسی لئے اللہ نے ان کی محبت کا حکم دیا ہے "**قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ**[۲]" تاکہ لوگ ان کی پیروی میں جہانی حکومت کی آمادگی کریں۔

---

[۱] سورہ توبہ ۳۳

[۲] سورہ شوری ۲۳

وضو میں پیروں کا مسح، فریقین کے نظریات کا مختصر تجزیہ

سید حمید الحسن زیدی سیتاپور

مسلمانوں کے درمیان بہت سے امور میں اختلافات ہیں چاہے وہ اختلافات عقائد سے متعلق ہوں یا امور شریعت سے ان اختلافات سے آگاہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ ان میں بہت سے اختلافات ایسے ہیں جن کی عام طور پر توقع کی جاسکتی ہے اس لئے کہ ان کے موضوعات ایک دوسرے سے مشتبہ اور بہت پیچیدہ ہیں جن کی بنا پر بہت سے شبہات پیدا ہوتے ہیں اس طرح کہ ہر انسان کے لئے ان میں غور و فکر کرنا اور انہیں سمجھنا آسان نہیں ہوتا۔

اور اگر ان کے بارے میں کوئی ایسا شخص غور و فکر کرتا ہے جو اس کا اہل نہ ہو تو اور اختلاف پیدا ہوتے ہیں اور لوگوں کی نظر میں دین و شریعت کے امور مشتبہ ہونے لگتے ہیں اس کی حقیقت پوشیدہ رہ جاتی ہے جیسے ''جبر و تفویض'' کا مسئلہ ''خلق قرآن کا مسئلہ''، ''جسمانی قیامت'' کا مسئلہ یا اس طرح کے دیگر بہت سے مسائل بلکہ اسلامی عقائد کے اکثر مسائل اسی طرح کے ہیں اگر آپ کو اس طرح کے مسائل میں مسلمانوں کے درمیان اختلافات نظر آتے ہوں تو یہ ایسے مسائل ہیں جن میں اختلاف ہونا طبیعی ہے اس لئے کہ ایسے مسائل کے بارے میں لوگوں کے ذہن و دماغ میں بہت سے سوالات ابھرتے ہیں جن سے ان کے بارے میں جستجو کرنے والا ہی واقف ہوتا ہے

البتہ ان کے مقابلہ میں کچھ مسائل ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں اختلاف بعید شمار ہوتا ہے جیسے وضو کی کیفیت میں اختلاف یا اسی طرح اس بات میں اختلاف ہے کہ بسم اللہ نماز میں سورہ کا جزء ہے یا نہیں، یا نماز میں ہاتھوں کو کہاں رکھا جائے، اس مسئلہ میں اختلاف وغیرہ ایسے امور میں ہیں جن پر نبی اکرمؐ نے روزانہ بار بار ۲۳ سال تک عمل کیا ہے اور یہ عمل لوگوں کی نگاہوں کے سامنے اس طرح انجام پایا ہے کہ وہ اسے سن بھی سکتے تھے اور دیکھ بھی سکتے تھے ایسے مسائل کے بارے میں اختلاف ایک عجیب شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں زیادہ تحقیق اور جستجو کی ضرورت پڑتی ہے اور تاریخی اعتبار سے اسکا بڑے وسیع پیمانے پر جائزہ لینا پڑ سکتا ہے تاکہ ان اسباب و عوامل کو سمجھا جاسکے جن کی بنیاد پر یہ اختلافات پیدا ہوتے ہیں اس مسئلہ پر تاریخی بحث کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ایک مقدمہ ذکر کیا جائے۔

وضو میں پیروں پر مسح کرنا یا انہیں دھونا انہیں مسائل میں سے ہے کہ جو بہت واضح ہیں اور اس میں کسی طرح کے اختلافات کی گنجائش نہیں لیکن بر خلاف توقع اس مسئلہ میں فقہائے اسلام اور مدارس فقہیہ کے درمیان معرکۃ الآرا بحث ہے ان میں سے کچھ لوگ مسح کو واجب سمجھتے ہیں یہ اثنا عشری شیعوں کا نظریہ اور مذہب ہے ابن عباس بھی انہیں میں ہیں[1] جب کہ کچھ دوسرے افراد وضو میں پیروں کے دھونے کو واجب سمجھتے ہیں جیسے اہل سنت کے بعض آئمہ کچھ دونوں کے درمیان اختیار کے قائل ہیں[2] یعنی وضو کرنے والے کو اختیار ہے کہ چاہے وضو میں پیروں پر مسح کرے یا انہیں دھوئے

---

[1] فقہ اہل بیتؑ ۱:۱۲۲ ط دار الثقلین

[2] فقہ مذاہب اربع ۱:۵۴

اس نظریہ کے قائل علماء میں محمد ابن جریر طبری اور حسن بصری ہیں جیسا کہ رازی وغیرہ نے ذکر کیا ہے[1] اسی طرح کچھ علماء اس بات کے قائل ہیں کہ وضو میں غسل اور مسح کے درمیان جمع کیا جائے یعنی دونوں کاموں کو انجام دینا واجب ہے اس نظریہ کے قائل داؤد ابن علی ظاہری اور زیدیوں میں ناصر للحق ہیں[2]۔

ان نظریات کے بارے میں بحث کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ وضو کے بارے میں قرآن کی تنہا آیت کو پیش کیا جائے جس میں ارشاد ہوتا ہے (یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ ؕ[3]۔

اے ایمان والوں جب تم نماز کیلئے کھڑے ہو تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کو کہنیوں سے دھوؤ اور اپنے سر اور پیروں کا ٹخنے تک مسح کرو۔

یہ آیہ کریمہ واضح طور پر وضو میں دونوں پیروں کے حکم سے متعلق ہے یہ دونوں پیر، ان چیزوں میں سے ہیں جن پر مسح کیا جائے اس لئے کہ وامسحوا کے بعد ان کا تذکرہ ہے اگر یہ ان اعضاء میں سے ہوتے جنہیں دھویا جاتا ہے تو انہیں خداوند عالم کے اس قول فاغسلوا کے بعد ہونا چاہئے تھا یہ مسئلہ ان بدیہی مسائل میں سے ہے جن میں کسی طرح کے پس و پیش کی گنجائش نہیں ہے یہ حکم ثابت ہے چاہے ارجلکم میں ارجل کو نصب کے ساتھ پڑھا جائے یا جر کے ساتھ اگر جر کے ساتھ پڑھا جائیگا جیسا کہ ابن کثیر، حمزہ ابی عمرو، عاصم کی ابو بکر سے روایت ہے کہ جر کے ساتھ پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ "**ارجل**" کو "رؤوس" پر عطف کیا گیا ہے اور سر پیر دونوں مل کر اعضاء وضو کی اس قسم میں سے قرار پاتے ہیں جن پر مسح کیا جاتا ہے اگر "**ارجل**" کو نصب کے ساتھ پڑھا جائے جیسا کہ نافع، بن طاہر، اور عاصم کی روایت ہے تو اس سے بھی مسح لازم آتا ہے اس لئے کہ کلمہ "**رؤوسکم**" محلاً منصوب ہے اگرچہ لفظی اعتبار سے "ب" کے ذریعہ مجرور ہے لہذا "**ارجل**" کو رؤوس کے محل نصب پر بھی عطف کیا جاسکتا ہے اور لفظ رؤوس پر عطف کر کے مجرور بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

یہ وہ عبارت ہے جسے فخر الرازی نے ذکر کیا ہے اور اس کے بعد تذکرہ کیا ہے کہ یہ نحویوں کا مشہور مذہب ہے[4]۔

پیر دھونے کے قائلین کی دلیلیں۔

وضو میں پیروں کو دھونے کا نظریہ اہل سنت کے چاروں مذاہب کا ہے انہوں نے اس سلسلہ میں بہت سی دلیلیں پیش کی ہیں انہیں میں ایک دلیل فخر الرازی نے اپنی تفسیر میں ذکر کی ہے یہاں تک وہ لکھتے ہیں کہ بہت سی روایات میں پیروں کا دھونا واجب قرار دیا گیا ہے اور دھونے میں مسح بھی شامل ہے جب کہ اس کے برعکس نہیں ہو سکتا یعنی مسح میں دھونا شامل نہیں ہو سکتا لہذا دھونا احتیاط سے

---

[1] تفسیر کبیر ۱۱:۱۶۶

[2] تفسیر کبیر ۱۱:۱۶۶

[3] سورۂ مائدہ:۶

[4] تفسیر کبیر ۱۱:۱۶۱

زیادہ قریب ہے اور اس پر عمل کرنا واجب ہے ایسا، یقین کے ساتھ اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ وضو میں پیروں کا دھویا جانا انکے مسح کو بھی شامل ہے اور پیروں کا صرف انکی بلندی تک محدود کرنا دھونے کیلئے ہے نہ کہ مسح کے لئے[1]۔

قرطبی کا بیان ہے کہ وضو میں پیروں کا دھونا واجب ہے نہ کہ انکا مسح کرنا یہ جمہور اور تمام علماء کا نظریہ ہے اور یہ نبی اکرم کے عمل اور آپ کے قول سے ثابت ہے جب آپ نے ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ وضو کر رہی تھی اور ان کے پیر کے پیچھے کا حصہ دکھائی دے رہا تھا بلند آواز سے چلا کر کہا پچھلے حصہ کے لئے جہنم میں ویل ہو صحیح وضو کرو تب خداوند عالم نے اسکی حد معین کی اور فرمایا کعبین (ابھار تک گٹا) تک جیسا کہ ہاتھ کے بارے میں اعلان کیا کہنی تک اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت دونوں پیروں کے دھونے کو واجب قرار دیتی ہے[2]۔

محمد رشید رضا صاحب تفسیر المنار کا کہنا ہے جمہور علماء نے ''ارجل'' کیلئے نصب کی قرأت کو اختیار کیا ہے اور جر کی قرأت کو بھی نصب کی طرف پلٹایا ہے اور اس کے لئے سنت صحیح سے تاکید ثابت کی ہے اسی پر اجماع اصحاب کا دعویٰ کیا ہے اور اس پر مزید یہ کہ پیروں کا دھونا طہارت کے حکم سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

طحاوی اور ابن حزم نے دعویٰ کیا ہے کہ مسح کا حکم منسوخ ہوگیا اس سلسلہ میں زیادہ تر (جمہور علماء) صدر اول کے عمل کو دلیل بناتے ہیں جس کی احادیث سے بھی تائید ہوتی ہے ان میں سب سے زیادہ صحیح حدیث کتب صحیحین میں ابن عمر سے نقل ہوئی ہے انکا بیان ہے کہ ہم سے رسول اسلامؐ ایک سفر میں الگ ہوئے ہم نے آپ کو ڈھونڈ لیا عصر کا وقت قریب تھا ہم وضو کرنے لگے ہم نے اپنے پیروں پر مسح کیا پیغمبر اسلامؐ نے بلند آواز سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا پچھلے حصے کے لئے جہنم کا ویل ہو آپ نے یہ جملہ دو یا تین مرتبہ ارشاد فرمایا یہ پیروں کے دھونے کو واجب قرار دینے والوں کی دلیلوں کا خلاصہ تھا[3]۔

وضو میں مسح کے قائلین کی دلیلیں۔

جو لوگ قائل ہیں کہ وضو میں پیروں کا مسح واجب ہے وہ صرف اثنا عشری شیعہ ہیں اس سلسلہ میں ان کی دلیلیں وضو کی آیت اور بہت سی روایات ہیں اس کے علاوہ خود آئمہ اہل بیتؑ سے مروی روایات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

آیت وضو میں خداوند عالم کا ارشاد ہے (فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ-[4]) مسح کے وجوب پر استدلال ''ارجل'' کو جر کے ساتھ پڑھنے سے بھی کیا جاسکتا ہے اور نصب کے ساتھ پڑھنے سے بھی اگر آیت میں ''ارجل'' کو جر کے ساتھ پڑھا جائے جیسا کہ ابن کثیر حمزہ ابی عمرو اور عاصم کی روایت ہے تو اس آیت کی پیروں کے

---

[1] تفسیر کبیر ۱۱:۱۶۲

[2] جامع احکام قرآن ۷:۹۱

[3] تفسیر منار ۷:۲۲۸

[4] سورہ مائدہ آیت ۶

مسح پر دلالت بالکل واضح طور پر ثابت ہو گی آیت نے **روؤس** (سر) اور **ارجل** (پیروں) کو ایک حکم میں جمع کیا ہے یعنی مسح کا حکم یعنی ارجل کو روؤس پر عطف کیا گیا ہے اور اسی کا حکم لگایا گیا ہے۔

اس نتیجہ کے واضح ہونے اور بعض بزرگان جیسے فخر رازی اور ابن کثیر اور ابن حزم محلی کے اسے تسلیم کرنے کے باوجود محمد علی ابن مارودی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جر کی قرأت کو صرف ایک وجہ پر حمل کرنا ممکن ہے جن میں سے ایک وجہ جوتوں پر مسح کرنا ہے۔ لہٰذا دونوں قرأتوں کا اختلاف دونوں الگ الگ معنی کی بنیاد پر ہو گا[1]۔

یہ صرف مجاورت اور پڑوس کی وجہ سے عطف ہے حکم کی بنیاد پر نہیں اس کا مطلب ہو گا کہ جر کی قرأت سے مسح کو ثابت نہیں کیا جاسکتا یہ انتہائی عجیب و غریب دعویٰ ہے آیہ کریمہ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ سے دونوں کا حکم براہ راست سر اور پیر کے لیے ثابت ہوتا ہے اور براہ راست جوتے کے ساتھ ممکن نہیں ہے لہٰذا جوتے پر مسح کے لئے فقیہ کو کسی دوسری دلیل کا سہارا لینا پڑے گا اگر یہ بات صحیح ہو اور اس سلسلہ میں جو عجیب و غریب دعویٰ کیا گیا ہے وہ صحیح ہو تو جو شخص جر کے ساتھ تلاوت کو ضروری سمجھتا ہے اس کے لئے واجب ہو گا کہ وہ نہ مسح کرے اور نہ پیروں کو دھوئے بلکہ جوتا پہن کر اس پر مسح کرے جب کہ متشرعہ یعنی شریعت کی پابندی کرنے والوں کی سیرت پیروں کے مسح کی رہی ہے یا انہیں دھونے کی۔ جوتے پہن کر اس پر مسح کرنے پر کسی طرح کی سیرت کبھی نہیں رہی ہے لہٰذا کیا وجہ ہے کہ ایک فقیہ آیت سے اتنی دور کی تاویل مراد لے اور عام تاویل کو چھوڑ دے جس کی عرف، سیرت متشرعہ لغت کسی سے بھی تائید نہ ہوتی ہو یہ گفتگو بھی محمد علی ابن مارودی کے احتمال کے بارے میں تھی جبکہ دوسرا احتمال صاحبان لغت اور مفسرین دونوں کی رو سے باطل ہے[2]۔

فخر رازی نے اس احتمال کی رد میں بڑی اچھی بات کہی ہے انھوں نے بیان کیا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ جوار کی بنا پر کسرہ دینا کیوں صحیح نہیں ہے تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے یہ چند وجہوں سے باطل ہے۔

۱۔ جوار (پڑوسی) کی بنا پر جو کسرہ ہوتا ہے اسے کھینچی ہوئی آواز کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے جس کے بارے میں یہ احتمال ہوتا ہے کہ ایسا ضرورت شعری کی بنا پر کیا گیا ہے کلام الٰہی اس طرح کی ضرورت سے پاک و منزّہ ہے۔

۲۔ کسرہ اس وجہ سے لایا جاتا ہے کہ اشتباہ سے بچا جاسکے اور اس آیت میں اشتباہ سے بچنا ممکن نہیں ہے جوار کی بنا پر کسرہ وہاں پر ہوتا ہے جہاں حرف عطف نہ ہو حرف عطف کے ساتھ عرب جوار کی بنا پر کسرہ نہیں دیتے لہٰذا فخر رازی کا نظریہ یہ ہے کہ "ارجل" پر کسرہ "ارجل" کے روؤس پر عطف ہونے کی بنا پر ہے لہٰذا جس طرح سر کا مسح واجب ہے اسی طرح پیر کا بھی مسح واجب ہے یہ گفتگو جر کی قرأت کی بنا پر تھی۔

---

[1] حاوی الکبیر ۱:۱۲۵

[2] تفسیر کبیر ۱۱:۱۶۱

اس کے علاوہ نصب کی قرأت سے بھی مسح کا وجوب ثابت ہوتا ہے جیسا کہ فخر رازی کا بیان ہے کہ "**وامسحوا بروؤسکم**" میں روؤس محلاً منصوب ہے اگرچہ لفظی اعتبار سے "ب" کے ذریعہ مجرور ہے اگر "ارجل" کو "روؤس" پر عطف کیا جائے تو ارجل میں عطف کی بنا پر نصب جائز ہوگا اور لفظ پر عطف کرنے کے اعتبار سے جر یہ مشہور نحویوں کا نظریہ ہے لہٰذا اگر یہ ثابت ہو جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ارجل کے لئے وامسحوا بھی ہو سکتا ہے اور فاغسلوا بھی اس طرح کہ اگر دو عامل کبھی ایک معمول پر جمع ہو جائیں تو قریب والے کو عمل دینا بہتر ہوتا ہے لہٰذا خداوند عالم کے قول "ارجلکم" کا عامل وَ امْسَحُوْا ہوگا لہٰذا "اَرْجُلَكُمْ" نصب کے ساتھ پڑھنا بھی مسح کے وجوب ہی کو ثابت کرتا ہے اور اگر نصب کی بنا پر پیروں کے دھونے کو ثابت کیا جائے تو یہ صرف باطل نحوی نظریہ کے مطابق ہی ہو سکتا ہے یعنی ارجل کو "وجوہ" پر عطف کیا جائے یہ بیچ میں فاصلہ ہونے کی بنا پر باطل ہے[1]۔

نحوی قاعدہ ہے اگر معطوف علیہ کئی ہو جائیں تو سب سے پہلے والے پر عطف کیا جاتا ہے اور وہ اس آیہ کریمہ میں روؤس (سر) ہے لہٰذا دور والے یعنی وجوہ کو معطوف علیہ قرار نہیں دیا جائے گا۔

اسی بنا پر فخر رازی کا نظریہ یہ ہے کہ وضو کی آیت مسح کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہے لیکن انھوں نے اس حکم کو بہت معمولی اور ضعیف دلیلوں کی بنا پر تسلیم نہیں کیا جنھیں انھوں نے اپنے گذشتہ کلام میں ذکر کیا ہے جیسے:

ا:۔ پیروں کے دھونے کے سلسلے میں وارد ہونے والی روایات میں انھیں دھونا واجب قرار دیا گیا ہے جب کہ ان روایات میں سے بعض روایات دھونے پر دلالت نہیں کرتیں

کچھ روایات ہیں جو ان روایات سے ٹکراتی ہیں اور مسح کے حکم کی تائید کرتی ہیں اگر دو طرح کی روایات آپس میں ٹکراتی ہیں تو دونوں کو ساقط کر کے کتاب خدا کی طرف رجوع کیا جائے گا

سید شرف الدین عبد الحسین نے اس احتمال کو رد کرتے ہوئے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ پیروں کو دھونے سے متعلق حکم کو بیان کرنے والی روایات کی دو قسمیں ہیں:

ا:۔ ایک قسم وہ جو پیروں کے دھونے پر دلالت نہیں کرتی جیسے عبد اللہ ابن عمرو ابن عاصم کی حدیث اسکا بیان ہے کہ جیسا کہ صحیحین میں وارد ہوا ہے کہ ایک سفر میں نبی اکرمؐ ہم سے بچھڑ گئے ہم نے آپؐ کو ڈھونڈ لیا اس وقت عصر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا ہم وضو کرنے لگے ہم پیروں کا مسح کرنا چاہتے تھے کہ آپ نے بلند آواز سے فرمایا پچھلے والوں کے لئے جہنم میں ویل ہو۔

یہ روایت اگر بشرط شیخین صحیح ہے تو مسح کو ثابت کرتی ہے اس لئے کہ رسول اسلامؐ نے انھیں مسح سے نہیں روکا بلکہ اس کی تائید فرمائی آپ نے صرف ان کے پچھلے کی گندگی کو ناپسند کیا[2] اور اس میں کوئی حرج نہیں اس لئے کہ اس وقت بہت سے جاہل عرب اس

---

[1] تفسیر کبیر ۱۱:۱۶۱

[2] تفسیر منار ۶:۲۸۸

طرح پیتاب کر لیا کرتے تھے کہ ان کے پیروں کے پچھلے حصے نجس ہو جاتے تھے خاص طور پر سفر میں لہٰذا پیغمبر اسلامؐ نے انھیں عذاب جہنم سے ڈرایا تاکہ وہ لوگ اس نجاست کے ساتھ نماز نہ شروع کر دیں۔

ان کے علاوہ کچھ روایات پیروں کے دھونے پر دلالت کرتی ہیں جسے عثمان بن عفان کے غلام حمران کی روایت اس کا بیان ہے کہ میں نے عثمان کو دیکھا وہ اپنے ہاتھوں پر اپنے برتن سے پانی ڈال چکے تھے انھوں نے اپنے ہاتھوں کو تین مرتبہ دھویا اور پھر اپنا داہنا ہاتھ پانی میں ڈالا اور کلیاں کی پھر تین مرتبہ ناک میں پانی ڈالا اس حدیث میں آیا ہے[1] کہ پھر انھوں نے تین مرتبہ اپنے پیروں کو دھویا پھر عثمان نے بیان کیا کہ میں نے نبی اکرمؐ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا اور آپ نے اسی طرح وضو فرمایا

اسی طرح کی حدیث عبد اللہ ابن زید ابن عاصم انصاری نے بھی روایت کی ہے کہ ان سے کہا گیا ہمیں رسول اسلامؐ کے جیسا وضو کر کے دکھائیے انھوں نے ایک برتن منگوایا اور اس میں سے چلو بھر پانی سے ہاتھوں کو دھویا اور اس روایت کے آخر میں ہے کہ انھوں نے اپنے پیروں کو ان کے ابھار تک دھویا اس کے بعد کہا کہ پیغمبر اسلامؐ اس طرح وضو فرماتے تھے اس کے علاوہ بہت سی دیگر روایات ہیں جو پیروں کے دھونے پر دلالت کرتی ہیں[2]۔

ہمیں اس بیان میں چند جہتوں سے اشکال ہے۔

ا:۔ یہ حدیث کتاب خدا اور آئمہ اہل بیتؑ کے اجماع کے خلاف ہے اور جیسا کہ واضح ہے کتاب اور عترت پیغمبر اسلامؐ کی امت کے درمیان دو گرانقدر امانتیں ہیں جو کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں اور ان سے وابستہ رہتے ہوئے امت بھی کبھی گمراہی کا شکار نہیں ہو سکتی لہٰذا ہر وہ چیز جو ان کے خلاف ہو اسے دیوار پر مار دینا چاہیے

لہٰذا وضو میں پیروں کے دھونے کا حکم نہ قرآن میں ہے نہ اہل بیتؑ کی روایات میں تو ہم وضو میں پاوں کے دھونے کو کیسے قبول کر سکتے ہیں جبکہ نہ قرآن سے اس کی تائید ہے اور نہ اہل بیتؑ کی روایات سے اس کے علاوہ اس سلسلہ میں وارد ہونے والی روایات کے ضعیف ہونے کے لئے یہی کافی ہے عبد اللہ ابن عباس جب تیمم کے بارے میں دلیل پیش کرتے ہیں[3] تو بیان کرتے ہیں کہ " **افترض الله غسلتين مسحتين الا ترى انه ذكر التيمم فجعل مكان الغسلتين مسحتين و ترك المسحتين**"۔ خداوند عالم نے دو چیزوں کا دھونا اور دو چیزوں کا مسح کا ذکر کیا ہے اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ربیع بنت معوذ ابن عفراء انصاریہ کا گمان ہے کہ نبی اکرمؐ جب وضو فرماتے تھے[4] تو اپنے دونوں پیروں کو دھوتے تھے تو وہ خود ان کے پاس گئے اور ان سے سوال کیا اور جب ربیع نے یہ بات

---

[1] صحیح بخاری ۱:۱۴۰

[2] صحیح مسلم ۱:۱۲۱

[3] کنزالعمال ص ۱۰۳ ج ۵ ح ۲۲۱۳

[4] کنزالعمال ص ۱۰۳ ج ۵ ح ۲۲۱۱

دہرائی تو ابن عباس نے کہا کہ اس کی تصدیق نہیں ہوئی ہے یہ ناپسندیدہ اور ناقابل قبول ہے لوگ دھونے کے علاوہ کسی اور چیز کا انکار کرتے ہیں اور مجھے کتاب خدا میں مسح کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا[1]۔

۲:۔ اگر یہ حدیثیں صحیح ہوتیں تو تواتر کے ساتھ وارد ہوتیں اس لئے کہ وضو میں پیروں کے دھونے کا سلسلہ پوری امت کی عورتوں اور مردوں کے لئے عام ہے چاہے وہ آزاد ہوں یا غلام یہ ایک ایسی ضرورت ہے جو انہیں روز و شب پیش آتی ہے اگر آیہ کریمہ نے مسح کے علاوہ کسی اور چیز پر دلالت کی ہوتی تو نبی اکرمؐ کے عہد میں اور اسکے بعد کے مکلفین اس سے آگاہ ہوتے اور یہ بات ان کے یہاں متفق علیہ اور تسلیم شدہ ہوتی اور اس کے بارے میں نبی اکرمؐ کی روایات تواتر کے ساتھ ثابت ہوتیں اور یہ روایات ہر شہر اور بستی تک پہونچتیں تو اس کے بعد انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی اور جب ایسا نہیں ہے تو پھر ان روایات پر بھروسہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے انہیں معتبر نہیں مانا جاسکتا۔

۳:۔ پیروں کی طہارت کے سلسلہ میں وارد ہونے والی روایات میں آپس میں ٹکراؤ ہے ان میں سے بعض پیروں کے دھونے کا تقاضہ کرتیں ہیں جسے حمران، ابن عاصم کی روایت میں بیان کیا جاچکا ہے اسی طرح بعض روایات مسح کو ثابت کرتی ہیں جیسے وہ حدیث جسے بخاری نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے[2]۔

اور جسے احمد ابن ابی شیبہ، ابن ابی عمر بغوی طبرانی اور ماردوی میں سے ہر ایک نے ایک ہی سند کے ساتھ نقل کیا ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں (تعیم بن زید قسم اول) ابو الاسود سے عباد ابن تمیم سے انہوں نے اپنے والد سے نقل کیا ہے پیغمبر اسلامؐ جب وضو فرماتے تھے تو اپنے پیروں پر مسح کرتے تھے اسی طرح وہ روایت ہے جسے شیخ نے اپنی صحیح میں آعین کے دونوں بیٹوں زرارہ اور بکیر کے حوالے سے امام محمد باقرؑ سے نقل کیا ہے کہ آپ پیغمبر اسلامؐ کے وضو کی حکایت کر رہے تھے آپ نے اپنے سر اور پیروں کا ان کے ابھار تک اپنے ہاتھوں میں بچی ہوئی تری سے مسح کیا اور مسح کے لئے آپ نے نیا پانی نہیں لیا[3]۔

ابن عباس سے روایت ہے کہ انہوں نے پیغمبر اسلامؐ کے وضو کی حکایت کرتے ہوئے اپنے دونوں پیروں کا مسح کیا[4] اور جب روایات میں آپس میں ٹکراؤ ہے تو پھر بہتر یہ ہے کہ ہم کتاب خدا پر عمل کریں جس سے بڑی کوئی دلیل نہیں ہے[5]۔

وہ مکمل عبارت جسے سید عبد الحسین شرف الدین نے نقل فرمایا ہے جیسا کہ ابن حزم کا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید میں وضو کے لئے پیروں کے مسح کا حکم حتمی طور پر بیان کیا گیا ہے ان کا بیان ہے کہ قرآن مجید میں مسح کا حکم نازل ہوا ہے اسے جر کے ساتھ پڑھا جائے یا نصب کے ساتھ اور سلف کی ایک جماعت بھی مسح کی قائل رہی ہے جن میں حضرت علیؑ، ابن عباس، امام حسنؑ، عکرمہ، شعبی وغیرہ ہیں

---

[1] کنز العمال ۹:۴۳۲ ح ۲۹۸۲۷

[2] تعیم بن زید ۱:۱۸۷

[3] تہذیب الاحکام ۱:۵۶ ح ۱۵۸

[4] مجمع البیان ۳:۲۰۸

[5] مسائل الفقہیہ ۹۲۔۹۵

اس کے علاوہ ایک دوسری جماعت مہاجرین کا بھی یہی کہنا ہے اور اس سلسلہ میں بہت سی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے[1]۔

لیکن اس کے بعد انہوں نے (ویل لا عقاب من النار) کی روایت بھی نقل کی ہے جس کے معنی ہیں پچلھے حصے والوں پر جہنم کا ویل ہو اور اس حدیث کو آیہ کریمہ کا ناسخ قرار دیا ہے جب کہ یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ یہ روایت آیہ کریمہ کی تائید کرتی ہے لہٰذا اسے ناسخ قرار نہیں دیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ ایک اور اشکال وارد ہے جیسا کہ فخر رازی نے ذکر کیا ہے کہ خبر واحد کے ذریعہ قرآن مجید کو نسخ نہیں کیا جا سکتا[2]۔

۲۔ فخر رازی نے پیر دھونے کے بارے میں ایک دوسرا قول بھی نقل کیا ہے کہ دھونے میں مسح بھی شامل ہے جب کہ مسح میں دھونا شامل نہیں ہے لہٰذا دھونا احتیاط سے قریب ہے اور اس کا قائل ہونا لازم ہے اور اس بنا پر اس بات کا یقین رکھنا واجب ہے کہ دھونا مسح کا قائم مقام ہو سکتا ہے اس قول پر سید عبد الحسین شرف الدین نے اعتراض کیا کہ فخر رازی کا یہ کہنا کہ دھونے میں مسح بھی شامل ہے اس میں واضح مغالطہ ہے[3] اس لئے کہ یہ عرف، شرح اور لغت تینوں کے اعتبار سے الگ الگ حقیقتیں ہیں لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ پیروں کا دھونا مسح کے قائم مقام نہیں ہو سکتا۔

امام رازی ایسی صورت میں متضاد اور غلط نظریات کے درمیان قرار پا رہے ہیں آیہ محکمہ اور خود اپنی نظروں میں صحیح روایات کی مخالفت اس کے لئے وہ اپنے کو یہ مغالطہ دے رہے ہیں کہ دھونا مسح کو بھی شامل ہوتا ہے اور یہ احتیاط سے قریب ہے لہٰذا وہ مسح کا قائم مقام بن سکتا ہے ان کا گمان ہے کہ اس طرح انہوں نے آیت اور حدیثوں کے درمیان جمع کر دیا اور جس شخص نے اس نظریہ میں ان کے دفاع کی کوشش کی وہ غلطی کا شکار ہوا اگر مسح کے واجب ہونے پر آیہ کریمہ کی دلالت واضح نہ ہوتی تو غسل کو اسکا قائم مقام بنانے کی ضرورت نہ پڑتی غور و فکر اور بھرپور دقت کے ساتھ ملاحظہ ہو[4]۔

۳۔ فخر رازی نے وضو میں دونوں پیروں کے دھونے کے لئے ایک اور وجہ ذکر کی ہے کہ آیت نے پیروں کے حکم کو ان کے ٹخنوں تک محدود قرار دیا ہے اور یہ حد بندی دھونے کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے اس لئے کہ "کعب" سے مراد وہ ٹخنے ہیں جو پیروں کے دونوں طرف ہوتے ہیں اور بیان ہو چکا ہے کہ قرطبی نے جامع احکام قرآن میں انہیں دونوں وجہوں کو ذکر کیا ہے سید عبد الحسین شرف الدین نے اس کے جواب کے لئے بیان کیا ہے کہ آیہ وضو میں کعبین سے مراد قدم کے جوڑ ہیں (قدمین الاول احوط و اقویٰ) جیسا کہ اعین کے فرزند ابن زرارہ اور بکیر سے نقل ہونے والی صحیح روایات سے واضح ہوتا ہے جب ان دونوں نے امام محمد باقرؑ سے کعبین کے بارے میں سوال کیا جیسا کہ جناب صدوق کی روایت سے ظاہر ہے

---

[1] محلی ۲:۵۶۔۵۷

[2] تفسیر کبیر ۱۱:۱۶۳

[3] ماخوذ فی مفہوم سیلانی

[4] مسائل الفقہیہ :۹۰

یہ صحیح بھی ہے اور انھوں نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہڈیوں کے ہر جوڑ کو کعب کہتے ہیں۔[1]

جمہور علماء کا نظریہ ہے کہ کعبین سے مراد قدم کے اطراف میں ہونے والے گٹے ہیں انہوں نے استدلال کیا ہے کہ اگر کعب سے مراد ہڈیوں کے جوڑ ہوتے تو ہر پیر میں صرف ایک کعب ہوتا لہٰذا آیہ کریمہ میں ہونا چاہیے تھا "وارجلکم الی الکعاب"، جیسا کہ ہر ہاتھ میں ایک کہنی ہوتی ہے تو آیت میں الی المرافق کہا گیا ہے۔

ہم کہیں گے کہ اگر آیت میں الی المرفقین کہا گیا ہوتا تب بھی یہ عبارت بلا کسی اشکال کے صحیح ہوتی اور آیہ کریمہ کے معنی یہ ہوتے کہ تم میں سے ہر شخص اپنے چہرے اور اپنی دونوں کہنیوں تک دھوئے اس کے بعد یہ فقرہ ہوتا "وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ "یعنی اب تم لوگ اپنے سر اور اپنے دونوں گٹوں تک مسح کرو۔ آیہ کریمہ میں تثنیہ اور جمع دونوں کا لانا ایک ہی جیسا ہے اسی طرح ایک کو تثنیہ اور دوسرے کو جمع لانا بھی صحیح ہے اور ایسا شاید عبارت میں تنوع کے لئے کیا گیا ہے یہ اس وقت ہوگا جب قدم میں صرف ایک کعب ہو ورنہ اگر ہر قدم میں دو کعب ہوں تو ان کے کلام کی کوئی وجہ نہیں رہ جاتی اور انسانی سرجری کے ماہرین بتاتے ہیں کہ ہر انسان کے قدم میں ایک گول ہڈی ہوتی ہے جس طرح بکری اور گائے کے کعب کہ اس کے پیر کی ہڈی کے نیچے اسکے قدم سے جو جوڑ ہوتا ہے اسے بھی کعب کہتے ہیں۔ (محمد بن حسن شیبانی)

لہٰذا ہر پیر کے مسح کی انتہا ہڈیوں کے جوڑ تک ہوگی جس کے نیچے ایک گول ہڈی اور ہوتی ہے جسے کعب کہا جاتا ہے اور کعب کو تثنیہ کی صورت میں ذکر کرنے میں بھی ایک لطیف اشارہ ہے جسے صرف سرجری کے ماہرین ہی سمجھ سکتے ہیں پاک و منزہ ہے وہ خلق کرنے والا جو علیم و حکیم ہے[2] اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جمہور کی فقہ کے مطابق جہاں پیر دھونے کے نظریہ کو اختیار کیا گیا ہے اس نے انہیں قرآن مجید سے ٹکراؤ میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ اس ٹکراؤ سے بچنے نیز اپنے دعوی کو ثابت کرنے کے لئے انتہائی پیچیدہ اور مشکل تاویلات کا شکار ہیں اس سلسلہ میں سب سے زیادہ ٹکراؤ کا شکار زمخشری ہیں انہوں نے تفسیر کشاف میں اس کشمکش سے بچنے کے لئے اپنے ہاتھ پاؤں مارے ہیں۔

سید عبد الحسین شرف الدین نے ان تمام کوششوں کو ذکر کر کے ان کا جواب دیا ہے وہ تحریر کرتے ہیں کہ زمخشری نے کشاف میں اس آیت کے ذیل میں فلسفیانہ بحث کرنے کی کوشش کی ہے ان کا کہنا ہے کہ پیر، ان تینوں اعضاء میں سے ہے جنھیں اوپر سے پانی ڈال کر دھویا جاتا ہے اور چونکہ ان میں اسراف کا خطرہ تھا جو قابل مذمت اور ممنوع ہے لہٰذا تیسرے والے کو ایسے عضو پر عطف کیا گیا جس کا مسح کیا جاتا تھا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایسا پیروں پر مسح کرنے کا حکم بیان کرنے کے لئے کیا گیا بلکہ ایسا اس لئے کہا گیا کہ پیروں کو دھوتے وقت پانی کے خرچ کرنے میں میانہ روی کا خیال رہے انکا کہنا ہے کہ الی الکعبین اس شخص کے شبہ کو دور کرنے کے لئے لایا گیا جو یہ سمجھ رہا تھا کہ پیروں کے مسح کا حکم دیا گیا ہے اس لئے کہ شریعت میں مسح کرنے کی کوئی حد معین نہیں ہے[3]۔

---

[1] لسان العرب ۱:۷۱۸

[2] مسائل الفقھیہ ۹۸_۹۹

[3] تفسیر کشاف ۱:۶۱۱

ارجل (پیروں) کو روؤس (سر) پر عطف کرنے کی وجہ یہی تھی اور اس کی بنا پر ارجل میں کعبین تک کی حد کا تذکرہ ہوا ہے اس گفتگو کی حقیقت اور گہرائی آپ ملاحظہ فرمائیں کہ اس میں آیہ محکمہ سے احکام شریعت کے استنباط میں کوئی مضبوطی نہیں ہے اور نہ ہی اس کی کوئی تفسیر ہے اور نہ ہی آیہ کریمہ اس گفتگو کے کسی پہلو پر دلالت کر رہی ہے بلکہ یہاں پر انھوں نے صرف آیہ کریمہ کو اپنے مذہب اور نظریہ پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے آیہ کریمہ سے نظریہ لینے کے بجائے آیہ کریمہ پر اپنا نظریہ تھوپنے کی کوشش کی ہے اور ایسی گفتگو کی ہے جسے کوئی بھی سننے کے لئے تیار نہیں ہے سوائے اس شخص کے جو اپنے کو وضو میں پیروں کے دھوئے جانے کے حکم میں دلیل سے بالاتر سمجھتا ہے لیکن اگر کوئی شخص اس بحث کو متنازع مانتا ہے وہ ہرگز اس گفتگو کی طرف توجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہے خاص طور پر کتاب خدا کے رو سے بظاہر مسح واجب ہے ہمارے لئے اس سلسلے میں عربی قواعد کی رو سے ارجل کو روؤس پر عطف کرنا ہی کافی ہے اس لئے کہ اس کے بارے میں نص بھی ہے اور اجماع بھی۔[1]

اور اس عطف کی بنا پر پیروں کے مسح کے قول کا صحیح ہونا ثابت ہے نہ کہ انھیں دھونے کا

[1] مسائل الفقھیہ :۹۲

اسلام اور ہندوازم میں صلح وامنیت

سید محمد مجتبیٰ علی رضوی، کلکتوی

خلاق کائنات نے اپنی تمام مخلوقات کے درمیان انسان کو سب سے بہتر اور اعلی قرار دیتے ہوئے اشرف مخلوقات کا شرف بخشا اور اس کی خلقت کے بعد خود کو احسن الخالقین کہا۔ گویا قدرت یہ بتانا چاہ رہی ہے کہ ہم نے انسانوں کو دوسری تمام مخلوقات سے مختلف اور الگ امتیازات کے ساتھ وجود بخشا ہے اور اس کی بنیادی وجہ انسانوں میں عقل و شعور کی نعمت ہے۔ باقی تمام مخلوقات اپنی فطرت کے مطابق ایک سی زندگی گزارتی ہیں لیکن دوسری طرف انسان ہے جسے ہر دن تبدیلی اور تحرک کا سامنا ہوتا ہے اس لئے کہ عقل و شعور کا تقاضہ ہے کہ اس میں حرکت اور جولانی رہے یہی صفت انسان کو جستجو گر بنادیتی ہے۔ اور وہی فطرت کی جستجو اور تلاش انسان کی تمام تر ترقیوں کا منبع اور تمام محصولات بشری کی بنیاد ہے۔ کل یہی انسان پہاڑوں کی غاروں میں سکونت پذیر تھا تو آج عالی شان مساکن اس کی تحقیق طلبی اور آگے بڑھنے کے عقلی رجحان کا نتیجہ ہے اسی بنیاد پر ساری ترقی اور تبدیلیاں وجود میں آتی ہیں۔

اسی طرح عقل و شعور میں جو کہ ترقی اور بالندگی کا عنصر ہے کافی اہمیت رکھتا ہے اور یہ اس کی فطری ضرورت اور کمال فطری بھی ہے۔ کہ عقل کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ محسوس کر سکے کہ اچھا اچھا ہوتا ہے اور برا، برا ہوتا ہے یعنی فطری تقاضے اور عقلی سالمیت کی دلیل یہ ہے کہ انسان اچھائیوں کا پسند کرنے والا اور برائیوں سے بیزار رہنے والا ہو، خلفشار اور شور و غل کے درمیان سکون پسند اور امن پسند ہو، کیونکہ عقل اس بات کی قائل ہے کہ بدامنی اور بے سکونی کے دوران عقل نہ کچھ ترقی کر پائے گی اور نہ کچھ کام اور نہ ہی اس کا شعور بلند ہو سکے گا، اس لئے صلح اور امنیت یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے، اور چونکہ تمام انسانوں کا خالق ایک ہے اور وہی خالق فطرت ہے اسی نے تمام انسانیت کی فطرت ایک رکھی کہ وہ امن پسند اور صلح طلب ہو اور قرآن میں اعلان ہے (فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيلًا[1]) خداوند عالم کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں آسکتی تو نتیجہ یہی ہوا کہ تمام انسان صلح پسند اور امنیت کے خواہاں ہیں اس فطری تقاضہ میں کسی مذہب کی کوئی قید نہیں۔ ہاں چونکہ خالق مذہب بھی وہی رب کریم ہے اور مذہب کو اس نے انسانی کمال کو حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ قرار دیا ہے۔ اور خود ہی اپنے نبیوں کے ذریعہ اپنے فرامین ہم تک بھیجے، تو اس میں بھی صلح اور امنیت کو بنیادی چیزوں میں قرار دیا۔ اور اس کے مقابل میں تشدد اور جنگ کو گناہ عظیم قرار دیتے ہوئے اسے یوں بیان کیا ہے کہ (مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ وَ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا[2]) جس کسی نے بھی ایک انسان کو بلاوجہ اور ناحق قتل کیا یا زمین پر فساد پھیلانے کے لئے قتل کیا تو گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کیا، اس طرح خداوند عالم نے تشدد اور جنگ کو روکنے کا ایک آفاقی منشور بنایا اسی طرح دوسری طرف امنیت کو واضح کرتے ہوئے اور اس کی اہمیت بتاتے ہوئے یوں فرمایا (وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا[3]) جس کسی نے ایک انسان کو بچایا

---

[1] سورہ فاطر، آیت ۴۳

[2] ۔ سورہ مائدہ، آیت ۳۲

[3] ۔ سورہ مائدہ، آیت ۳۲

گویا اس نے پوری انسانیت کو بچایا، اس کا مطلب امن پسند اور صلح دوستی انسانی سماج کا اہم ستون ہے جسے مذہب اور طاقت دیتے ہوئے انسانی کمال میں اس کو شامل کرتا ہے جہاں امن ہوگا وہاں ترقی ہوگی۔

اسلام کی صلح و امن پسندی

جہاں تک اسلام کی بات کی جائے تو اسلام کے تو بنیادی ارکان میں صلح اور امن شامل ہے حضرت علی علیہ السلام نے جب مالک اشتر کو مصر کا گورنر بنایا اور ان کو حکومت کا وہ دستور العمل دیا جو آفاقی حیثیت رکھتا ہے اس کا ایک مشہور جملہ یہ ہے:

"لوگ دو طرح کے ہیں ایک مسلمان وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور دوسرے غیر مسلم وہ تمہارے انسانی بھائی ہیں"

اس نظریہ کے تحت تمام تعصبات ختم ہو جاتے ہیں کوئی غیر ہے ہی نہیں تو تعصب کیسا اور کس کے ساتھ ؟ یہ آفاقی منشور حضرت علی نے بظاہر مالک اشتر کو دیا تھا لیکن اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو یہ ایک بہترین فارمولہ ہے حکومت چلانے کا جہاں ایسی حکومت ہوگی تو حاکمان وقت کسی طرح کا کوئی تعصب اور کوئی فرق نہیں کریں گے اور ہر ایک کو اپنا سمجھیں گے تو وہاں کی حکومتیں ترقی کی منزلوں کو طے کریں گی۔

غیر مسلموں کے ساتھ امن و آشتی

کفر اور شرک کو اسلام نے گناہ عظیم مانا ہے لیکن اس کے باوجود ہیں کسی بھی غیر مسلم کو اذیت پہنچانے، ان پر ظلم کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اسلام کہتا ہے تمہیں ان غیر مسلموں کے ساتھ صلح و آشتی رکھنی چاہیے اور ان کی مدد کرنا چاہیئے حتی جنگ کے دوران بھی ان کے ساتھ حسن خلق سے پیش آنا چاہیے ایک طرف ہمارے پیغمبر گرامی اور ان کے حقیقی جانشینوں نے اپنے عمل سے انسانی اقدار کا ثبوت پیش کیا جس کے دو نمونہ ہم پیش کر رہے ہیں

جنگ خیبر کے دوران ایک دن مسلمانوں نے یہودیوں کے ایک چرواہے کو پکڑ لیا جو یہودیوں کی بکریوں کو چرا رہا تھا اور بھیڑ بکریوں سمیت لشکر اسلام میں لے آئے تاکہ اس کو قید کر لیں اور بھیڑ بکریوں کو اپنی غذا بنالیں، لیکن جب حضور کو پتہ چلا تو آپ نے اس کام کو سختی سے منع فرمایا اور اسے بھی آزاد کرنے کی بات کہی تو اس نے کہا آپ مجھے آزاد کر رہے ہیں تو میں ایک اہم راز بتادوں جس سے یہ سارے یہودی خود بخود ہتھیار ڈال دیں گے، اس نے بتایا کہ قلعہ خیبر میں پانی کا کوئی کنواں نہیں ہے اور وہاں پینے اور استعمال کا سارا پانی ایک نہر کے ذریعہ قلعہ میں جاتا ہے اگر آپ اس نہر کو روک لیں تو سارے قلعہ میں قحط آب ہو جائے گا اور یہودی پیاس سے جان بہ لب ہو جائیں گے تو ایسے موقع پر آپ کی سب باتیں مان لیں گے۔ لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اعلی ظرفی کو ثبوت دیتے ہوئے ایسے کسی بھی اقدام سے سختی سے منع فرمادیا اور فرمایا کہ یہ کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے اس بات کا اس چرواہے پر اتنا اثر ہوا کہ وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ یہ ہے اسلام کی میدان جنگ میں امن پسندی اور انسانیت کا خیال۔

حضرت علی علیہ السلام ایک نابینا یہودی موچی کی مدد مسلمانوں کے بیت المال سے کرتے ہیں اور اس سے قبل مدد نہ کئے جانے پر مسلمانوں کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب تک یہ کام کرنے کے قابل تھا تم لوگوں نے اس کا فائدہ اٹھایا یعنی اس سے کام

لیا اب جب وہ کام کے قابل نہیں ہے تو تم نے اسے گدائی کے لئے مجبور کر دیا ہے۔ آپ نے بیت المال سے مدد کر کے انسانیت کا جو پیغام دیا ہے وہ ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ اور سماجی مساوات کی بہترین مثال ہے۔

دوسری طرف انھوں اپنے بیان میں ظلم کی شدت سے ممانعت کی ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ فرماتے ہیں: ''من قتل نفسا معاهدا لم یرح رائحة الجنة و ان ریحها یوجد من مسیرة اربعین عاماً'' جو کسی کافر ذمی کو بلاوجہ (ناحق) قتل کرے تو وہ جنت کی بو تک نہیں سونگھ سکتا جب کہ اس کی بو چالیس سال کی مسافت کے راستہ تک پھیلی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی اعتبار سے ہر ایک انسان کا خیال رکھنا سماج اور معاشرہ میں امن و سکون رکھنا یہ الٰہی پیغامات کا ایک اہم حصہ ہے اسلام کو نہیں ماننا یہ ان کا اعتقادی مسئلہ ہے لیکن انسانیت کا لحاظ رکھنا ہمارے لئے شرعی مسئلہ ہے۔ اگر وہ بھوکے ہیں تو ہمارا دینی فریضہ یہ ہے کہ ان کو کھانا کھلائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ہماری انسانیت اور ہمارے اخلاق سے متاثر ہو کر اسلام دوست ہو جائیں، جیسا کہ بزرگوں نے کیا ہے جس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد دائرہ اسلام میں داخل ہوئی، بہت سی تہذیبوں میں طبقاتی فرق تھا، اونچ نیچ کی فضا قائم تھی اس سے پسماندہ طبقہ کافی کسمپرسی کی زندگی گذار رہا تھا لیکن اسلام نے کھلے دل سے سب کا استقبال کیا اور ہر ایک کو برابری کا درجہ دیا اور مسلمان ہونے کے بعد کوئی چھوٹا نہ رہا کوئی بڑا نہ ہوا بلکہ سب ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر نمازیں ادا کرتے ہیں اور تمام طبقاتی افتراق اور تمام نسلی امتیازات کو ختم کرتے ہوئے (انما المومنون اخوة) کی مثال پیش کرتے ہیں جس کے سبب لوگ اسلامی امنیت و برابری سے متاثر ہونے لگے۔

ہندوازم میں صلح وامنیت

اسلام اور دوسرے تمام قدیم مذاہب کی طرح ہندو دھرم میں بھی اخلاق وانسانی قدروں اور امن و صلح کا بہت خیال رکھا گیا ہے اور انسانیت اور انسانوں کا خیال رکھنے پر کافی زور دیا گیا ہے۔ اور تمام مذہبی کتابوں جنہیں شاستر، گرنتھ اور وید وغیرہ کہا جاتا ہے ان میں امن و آشتی پر کافی تاکید کے ساتھ تذکرہ ملتا ہے یہاں ہم مختصر طور پر ان کو بیان کر رہے ہیں تاکہ یہ بات مکمل ہو جائے کہ اسلام کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب میں بھی امن و آشتی کی کافی اہمیت رکھتی ہے۔

قدیم ہندو دھرم کے شاستروں اور گرنتھوں کی روشنی میں اخلاقی تعلیمات کے بغیر باہمی میل جول رہن سہن اور آپسی برتاؤ و سلوک بحسن و خوبی عمل میں نہیں آسکتے[2]

ہندو مذہب کی کتابوں کے مطابق ایک ہندو کے لئے ضروری ہے کہ اخلاقی قدروں سے آشنا ہو تاکہ سماج میں امن و سکون اخلاق و محبت سے رہ سکے اور دوسروں کو بھی کوئی تکلیف نہ دے۔

شاستروں نے بھی اخلاق و آداب کو دھرم کا خاص حصہ تسلیم کیا ہے اور کہا ہے کہ وید، اپنشد اور اسمرتیوں وغیرہ کی اخلاقی تعلیمات دھرم کے لئے مجسم مشعل راہ ہیں۔[3]

---

[1] ۔ بخاری شریف، کتاب الدیات، باب ۲۵، حدیث ۱۸۰۶

[2] اسلام اور ہندو دھرم کا تقابلی مطالعہ، ج ا، ص ۷۴۲

[3] اسلام اور ہندو دھرم کا تقابلی مطالعہ، ج ا، ص ۷۴۳

اسی لئے منو اسمرتی میں مذکور ہے کہ: "وید، اسمرتی، سداچار اور اپنی اپنی آتما (روح) کا پسندیدہ اطمینان یہ چار سراپا دھرم کی علامات ہیں۔[1]
منو اسمرتی کے مطابق اخلاق مند انسان کو ہی مذہبی اعمال کا بہترین اجر حاصل ہوتا ہے بد اخلاق کو وید پڑھنے کا ثواب نہیں ہوتا ہے۔ ثواب اور نیکی کا فائدہ بھی اسے ہی ملے گا جو اخلاق مند ہوگا، اس پر عمل ہو جائے تو سماج سے ہر ظلم کا خاتمہ ہو جائے گا۔

منو مہاراج کہتے ہیں: "بد اخلاق برہمن کو وید کا پھل نہیں حاصل ہوتا ہے اور اخلاق مند برہمن وید کا مکمل پھل پالیتا ہے۔ مُنیوں نے اخلاق سے ہی سب دھرموں کی کامیابی دیکھ کر اخلاق کو ہی سبھی عبادت اور ریاضت کی اصل تسلیم کیا ہے"[2] اور یہی بات بھاگوت میں بھی کہی گئی ہے کہ زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت نیک صفات اور عمدہ اخلاق کی ہے، لہٰذا نیک صفات سے ہی متصف ہونا چاہیئے اور ایسا کام کرنا چاہیئے جس میں سب کا بھلا ہو اور کسی پر ظلم نہ ہو[3]

ان تمام باتوں کا مطلب یہی ہے کہ ہندو دھرم کی بنیادی تعلیمات بھی انسانی اقدار اور امن و آشتی پر ہی موقوف ہیں۔ یہ مذہب بھی عبادات کے ساتھ ساتھ انسانیت کا درس دیتا ہے اور کسی پر بھی ظلم کرنے کا روادار نہیں ہے۔
جب ہر ایک فرد با اخلاق ہوگا اور انسانیت کا مکمل خیال رکھے گا تو نہ کسی پر ظلم ہوگا نہ زیادتی ہوگی اور پورا سماج پر سکون رہے گا، جس کے نتیجہ میں ایک ایسی امن کی فضا قائم ہوگی کہ پھر کسی کو کسی سے خوف نہیں ہوگا اور یہ اطمئنان معاشرہ اور سماج کو ترقی دلانے کا ضامن ہوگا۔

ایکتا و بھائی چارہ

ایکتا و بھائی چارہ جسے ہم اتحاد و اتفاق کہتے ہیں یہ ایک ایسا اکسیر ہے کہ جو سماج کو محفوظ رکھتا ہے اور تمام انسانوں کی زندگی پر سکون رہتی ہے سب الگ الگ مذہب کے ہونے کے باوجود اسی اتحاد اور ایکتا کے فارمولے کے تحت ایک سماج میں باقی اختلافات کے ساتھ رہ سکتے ہیں اس سے سماج میں یا مذہبی امور میں کسی طرح کی نہ رکاوٹ آئے گی اور نہ کسی کے مذہب کو کوئی نقصان یا خطرہ درپیش ہوگا۔ بلکہ اور انسانیت اور اخلاق دونوں کو تقویت ملے گی۔ جس کو اسلام نے بھی ایک اصل کے طور پر پیش کیا ہے کہ پورا سماج ایک جسم کی مانند ہے جہاں سب ایک ہیں اور ہر ایک برابر کا حق دار ہے۔ اور جب سب مل کر رہیں گے تو سب ایک دوسرے کی طاقت بنیں گے اور ایک دوسرے کا سہارا بنیں گے۔ لہٰذا اسی سلسلے کا ایک اقتباس پیش ہے :
"ہندو دھرم کے گرنتھوں کے مطابق "سماجی تنظیم "(سنگٹھن) کی بنیاد ایکتا و بھائی چارہ ہے اسی جذبہ کے تحت ہی مختلف افراد و تنظیموں کو ایک لڑی میں پرویا جاسکتا ہے تنظیم کا ہر فرد کل کا نمائندہ ہوتا ہے اور پوری تنظیم اس کی طاقت ہوتی ہے۔ تنظیم (سنگٹھن) میں کوئی شخص خود کو بے سہارا محسوس نہیں کرتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ سماج کو منظم (سنگٹھت) کیا جائے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ سماج میں باہمی ایکتا اور بھائی چارہ اور آپسی محبت و ہمدردی کا جذبہ بیدار ہو کیونکہ جہاں ہمدردی اور بھلائی ہوتی ہے وہاں قلبی اتحاد (ہاردک ایکتا) ہوتا ہے۔ اور باہمی تعاون کا جذبہ ہی سماج کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے انہیں وجوہات کے پیش نظر قدیم ہندو دھرم گرنتھوں نے ایکتا و

---

[1] ۔ منو اسمرتی ادھیائے ۲، اشلوک ۱۲

[2] منو اسمرتی، ادھیائے ۱، اشلوک ۱۰۲۔ ۱۱۰

[3] مہابھارت

بھائی چارہ اور باہمی محبت و ہمدردی کی اخلاقی تعلیمات پر کافی زور دیا ہے اور کہا ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کی حفاظت کرے انہیں مصیبت اور تکلیف سے بچائے آپس میں عداوت نہ رکھے ایک دوسرے کے ساتھ اچھی گفتگو کرے اور ہمیشہ ایک دوسرے کا تعاون کرے۔"[1]

اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ ہندو دھرم میں بھی انسانیت اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور آپسی میل جول جو صرف ہندوؤں کا آپس میں نہیں بلکہ پوری انسانیت سے ہو اس پر بہت تاکید کی گئی ہے۔ جب سب مل کر رہیں گے تو ایک دوسرے کی مشکلات بھی مل کر حل کریں گے اور ایک دوسرے کی مدد بھی کریں گے، اس سے نہ کوئی پریشان ہوگا اور نہ کوئی بے سہارا ہوگا اور اس میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ صرف اس مذہب کے ماننے والے ایک سنگٹھن کے طور پر ہوں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انسان اور پورا معاشرہ ایک سنگٹھت اور متحد رہے جس میں ہر مذہب اور ہر دھرم کے لوگ شریک بھی رہیں اور مل کر بھی رہیں۔

پیغام امن و امنیت

ویدوں میں بھی آیا ہے کہ "ہمیں دوست، دشمن، جان پہچان، یا انجان لوگوں سے ڈر نہ ہو اور رات سے کوئی ڈر نہ ہو سارا سنسار ہمارا دوست ہو اور دنیا میں رہنے والے سارے جاندار ہمارے دوست ہوں۔[2] جگہ جگہ انسانوں کی حفاظت کرنا اور ہمدردی کی تاکید ملتی ہے۔

چنانچہ بیان ہو رہا ہے کہ "ایک دوسرے کی ہمیشہ حفاظت کرنا اور مدد کرنا انسانوں کا خاص فریضہ ہے[3]۔

میں انسان کیا سبھی جانداروں کو محبت کی نگاہ سے دیکھوں ہم سب آپس میں ایک دوسرے کو دوست کی نگاہ سے دیکھیں[4]۔

آپس میں میل جول، دوستی قائم کرو آپس میں بول چال یا مذہب کی چرچا کرو خود کو نیک اور عمدہ اخلاق سے مزین کرو جیسے پہلے زمانے کے بزرگ لوگ اپنے فرائض کے حصوں پر ہم خیال ہو کر آپس میں طے کر کے تقسیم کیا کرتے تھے ویسے ہی تم بھی کرو۔[5]

ویدوں کے مذکورہ بالا منتروں میں صاف صاف آپسی ایکتا امن و امنیت محبت اور ہمدردی کی باتیں بیان ہوئی ہیں اور گرنتھوں میں بھی یہی تعلیم دی گئی ہے۔ ان سب میں بھی تمام انسانیت کی بات ہے ہر انسان کی بات ہے کوئی مذہبی تفریق نہیں ہے بلکہ پوری بشریت کی بات ہے جہاں مختلف دھرموں کے لوگ ہیں مختلف مکتب فکر کے لوگ ہیں لیکن سماج میں ہیں تو سب ایک ہیں۔ اور ہر ایک اپنی اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے والا ہو۔

چنانچہ لوگ وششٹھ میں ہے "یہاں اس دنیا میں سب تکالیف کو مٹانے کے لئے صرف اور صرف دوسرے کی بھلائی کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ نہیں"[6] دوسروں کیساتھ بھلائی کو ہی سماجی مرض کی دوا کہا گیا ہے۔ جس کے ذریعہ ساری تکالیف دور ہو جاتی ہیں۔

---

[1] اسلام اور ہندو دھرم کا تقابلی مطالعہ، ج۱، ص۷۵۶

[2] ۔ارتھوید، ۲۔۱۵۔۱۹

[3] ۔ترگوید۔ ۱۴۔۷۵۔۶)

[4] لیجر وید، ۱۸۔۳۶

[5] ویدک ساہتیہ میں مانو کرتویہ، ۱۹۷

[6] ۔یوگ واششٹھ، ۴، ۶، ۱۴

گیتا کا قول ہے کہ ایسا شخص ایشور کو بہت پیارا ہے جو کسی جاندار سے حسد نہیں کرتا سب کا دوست اور سب سے مہربان ہے[1]۔

رام چرترمانس میں اس طرح بیان ہوا ہے "دوسروں کی بھلائی سے بڑھ کر کوئی دھرم نہیں ہے اور دوسروں کو تکلیف پہنچانے سے بڑھ کر کوئی پاپ نہیں ہے۔ [2]بھلائی کرنے کو سب سے بڑا دھرم کہا گیا ہے یعنی مذہب کی بنیادی چیزوں میں شمار کیا جارہا ہے، اس کے برعکس دوسروں کو تکلیف پہنچانے کو سب سے بڑا گناہ تصور کیا جارہا ہے۔ جو بالکل اسلامی نقطہ نظر کے مساوی ہے وہاں بھی انسانیت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

آخر کلام

اسلام کی کتابوں اور منابع میں صلح و انسیت کے کثیر تعداد میں پیغامات دیکھنے کو ملتے حتی اسلام کے سچے رہبروں نے صلح آشتی کے وہ عملی نقوش چھوڑے ہیں جو دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں ملتے کیونکہ انھوں میدان جنگ میں بھی اپنے انسانی اقدار سے چشم پوشی نہ کی

اسی طرح ہندو مذہب کی تمام گرنتھوں، کتابوں اور علماء کے بیان میں ایکتا، بھائی چارہ، امن و انسیت کی کثرت سے تعلیم دی گئی ہے۔ اور سب کے آپسی میل جول پر کافی زور دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہندو دھرم میں بھی ظلم روا نہیں بلکہ وہ سب کو چین اور امن سے زندگی بسر کرنے کا حکم دیتا ہے لہذا دونوں مکاتب فکر کا ہدف ظلم سے ستیز اور سماجی، اخلاقی، معاشرتی، سیاسی خرابیوں کا خاتمہ ہے۔

ان دونوں مذہب کی تمام باتوں کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے کہ ظلم کو برداشت نہ کیا جائے اور نہ ہی اس کی حمایت کی جائے یہ تو بس کچھ افراد ہوتے ہیں جو اپنے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر مذہب کی آڑھ میں انسانیت پر ظلم کرنے کو اپنی کامیابی سمجھتے ہیں، جبکہ اصل کامیابی ظلم سے نہیں بلکہ امن سے حاصل ہوتی ہے۔ سرو تن میں جدائی اور زندگی کا خاتمہ ظلم کی انتہا ہوتا ہے لیکن امن و انسیت کی کوئی انتہا نہیں ہوتی بلکہ جتنا امن بڑھے گا زندگی اتنی پر سکون ہوتی جائے گی۔

معاشرہ اور سماج کی بقا اور ترقی ظلم سے نہیں ہوتی ہے ظلم سے تو وقتی اقتدار حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن باقی رہنے اور لوگوں کے دلوں پر حکومت کرنے کے لئے امن و سکون کی فضا قائم کرنا ضروری ہوتا ہے، اور جتنا سماج پر سکون ہوگا حکومتوں کو بھی اتنا ہی دوام ملے گا۔

---

[1] ۔ گیتا ۱۲،۱۳

[2] رام چرترمانس، اترا کھنڈ، ۴۰

عید زہرا سلام اللہ علیہا

پیغمبر نوگانوی

ہمارے معاشرے میں بہت سی عیدیں آتی ہیں جیسے عید قربان، عید غدیر، عید مباہلہ اور عید زہرا علیہا السلام وغیرہ... یہ ساری عیدیں کسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں.

عید الفطر: یکم شوال کو ایک مہینہ کے روزے تمام کرنے کا شکرانہ اور فطرہ نکال کر غریبوں کی عید کا سامان فراہم کرنے کا ذریعہ ہے.

عید قربان: ۱۰/ذی الحجہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو خدا نے ذبح ہونے سے بچالیا تھا اور اُن کی جگہ دنبہ ذبح ہو گیا تھا، جس کی یاد مسلمانوں پر ہر سال منانا سنت ہے.

عید غدیر: ۱۸/ذی الحجہ کو غدیر خم میں مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کی مولی بنائے جانے کی یاد میں ہر سال منائی جاتی ہے، اِس دن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر خم کے میدان میں مولائے کائنات کو سوا لاکھ حاجیوں کے درمیان، اللہ کے حکم سے اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر کیا تھا.

عید مباہلہ: ۲۴/ذی الحجہ کو منائی جاتی ہے، اس روز اہل بیت علیہ السلام کے ذریعہ اسلام کو عیسائیت پر فتح نصیب ہوئی تھی.

عید زہرا: ۹/ربیع الاول کو منائی جاتی ہے اور اس عید کے منانے کی مختلف وجہیں بیان کی جاتی ہیں، مثلاً:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ۹/ربیع الاول کو دشمن حضرت زہرا علیہا السلام ہلاک ہوا، لہٰذا یہ خوشی کا دن ہے اور اس روز کو "عید زہرا (ع)" کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔

اس بارے میں علماء و مورخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، بعض کہتے ہیں اس کی وفات نہم ربیع الاول کو ہوئی اور بعض دیگر کہتے ہیں کہ ۲۶/ذی الحجہ کو ہوئی... جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ۹/ربیع الاول کو ہوئی اُن کا قول قابل اعتبار نہیں ہے، علامہ مجلسی اس بارے میں اس طرح وضاحت فرماتے ہیں کہ:

... اگر ۹/ربیع الاول فرض کر لیا جائے (کہ جو غلط ہے) تب بھی حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کی شہادت پہلے ہوئی اور آپ کے دشمن یکے بعد دیگری بعد میں ہلاک ہوئے... تو پھر اپنے دشمنوں کی ہلاکت سے حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کس طرح خوش ہوئیں!... لہٰذا عید زہرا علیہا السلام کی یہ وجہ غیر معقول نظر آتی ہے.

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ۹/ربیع الاول کو جناب مختار نے امام حسین (ع) کے قاتلوں کو واصل جہنم کیا... لہٰذا یہ روز شیعوں کے لئے سرور و شادمانی کا ہے. ہم نے معتبر تاریخ کی کتابوں میں بہت تلاش کیا لیکن کہیں یہ بات نظر نہ آئی کہ جناب مختارؒ نے ۹/ربیع الاول کو امام حسین (ع) کے قاتلوں کو واصل جہنم کیا تھا... لہٰذا یہ وجہ بھی غیر معقول ہے.

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جناب مختارؒ نے ابن زیاد کا سر امام زین العابدین علیہ السلام کی خدمت میں مدینہ بھیجا اور جس روز یہ سر چوتھے امام علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا وہ ربیع الاول کی ۹/ تاریخ تھی، امام علیہ السلام نے ابن زیاد کا سر دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور مختار کو دعائیں دیں نیز اسی وقت سے ان عورتوں نے بالوں میں کنگھی اور سر میں تیل ڈالنا اور آنکھوں میں سرمہ لگانا شروع کیا جو واقعہ کربلا کے بعد سے ان چیزوں کو چھوڑے ہوئے تھیں.

جن کے گھر میں شریعت نازل ہوئی اور اس شریعت نے صفائی ستھرائی کی بہت زیادہ تاکید کی ہو اور صفائی کو ایمان کی نشانی بتایا ہو وہی لوگ اتنے دن تک بغیر سر میں کنگھی کئے اور سر صاف کئے رہے!؟ کونسے سماج میں سر صاف کرنا اور سر میں تیل ڈالنا خوشی کی علامت سمجھا جاتا ہے!؟

بالفرض اگر اسے صحیح مان لیا جائے تب بھی یہ عید جناب زینب علیہا السلام اور جناب سید سجاد علیہ السلام سے منسوب ہونی چاہئے تھی... اور ہمیں بھی امام زین علیہ السلام کی پیروی کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ شکر خدا ادا کرنا چاہئے تھا اور جناب مختارؒ کے لئے دعائے خیر کرنا چاہئے تھی، لیکن نہ تو یہ عید چوتھے امام علیہ السلام سے منسوب ہوئی اور نہ جناب زینب علیہا السلام کے نام سے مشہور ہے لہٰذا عید زہرا علیہا السلام کی یہ وجہ بھی غیر معقول ہے.

بعض علماء کی تحقیق کے مطابق ۹/ ربیع الاول کو جناب رسول خدا کی شادی جناب خدیجہ علیہا السلام سے ہوئی تھی اور حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام ہر سال اس شادی کی سالگرہ مناتی تھیں اور جشن کیا کرتی تھیں، نئے لباس اور انواع و اقسام کے کھانے مہیا کرتی تھیں، لہٰذا آپ کی سیرت پر عمل کرتے ہوئے شیعہ خواتین نے بھی یہ سالگرہ منانی شروع کی اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا، آپ کے بعد یہ خوشی آپ علیہا السلام سے منسوب ہو گئی اور اس طرح ۹/ ربیع الاول کا روز شیعوں کے درمیان عید زہرا علیہا السلام کے نام سے موسوم ہو گیا، لہٰذا عید زہرا علیہا السلام کی یہ وجہ مناسب معلوم ہوتی ہے، چنانچہ ایک شخص نے آیت اللہ کاشف الغطاء سے سوال کیا کہ:

"مشہور ہے کہ ربیع الاول کی نویں تاریخ جناب فاطمہ زہرا علیہا السلام کی خوشی کا دن تھا اور ہے اور یہ اس حال میں ہے کہ آپ سلام اللہ علیہا کے دشمن کو ۲۶/ ذی الحجہ میں زخم لگا اور ۲۹/ ذی الحجہ کو ہلاکت ہوئی لہٰذا یہ تاریخ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی وفات سے بعد کی تاریخ ہے تو پھر حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا (اپنے دشمن کے فوت ہونے پر) کس طرح خوش ہوئیں؟

اس کا جواب آیت اللہ کاشف الغطاء نے اس طرح دیا کہ:

"شیعہ پُرانے زمانے سے ربیع الاول کی نویں تاریخ کو عید کی طرح خوشی مناتے ہیں... کتاب اقبال میں سید ابن طاؤس نے فرمایا ہے کہ ۹/ ربیع الاول کی خوشی اس لئے ہے کہ اس تاریخ میں دشمن حضرت زہر ہلاک ہوا ہے اور یہ بات ایک ضعیف روایت سے لی گئی ہے جس کو شیخ صدوق نے نقل کیا ہے، لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ ۹/ ربیع الاول کو شیعوں کی خوشی شاید اس وجہ سے ہے کہ ۸/ ربیع الاول کو امام حسن عسکری علیہ السلام شہید ہوئے اور ۹/ ربیع الاول امام زمانہ علیہ السلام کی امامت کا پہلا روز ہے...

اس خوشی کا دوسرا احتمال یہ ہے کہ ۹/اور ۱۰/ربیع الاول پیغمبر اسلام کی جناب خدیجہ سے شادی کا روز ہے اور حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام ہر سال اس روز خوشی مناتی تھیں اور شیعہ بھی آپ کی پیروی کرتے ہوئے ان دنوں میں خوشی منانے لگے، مگر شیعوں کو اس خوشی کی یہ علت معلوم نہیں ہے"[1]

اس سلسلہ میں بعض حضرات و خواتین غلط بیانی کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اس دن جو چاہیں گناہ کریں اس پر عذاب نہیں ہوتا اور فرشتے لکھتے بھی نہیں اور یہ لوگ علامہ مجلسی کی کتاب بحار الانوار کی اس طویل حدیث کا حوالہ دیتے ہیں جس کو علامہ مجلسی نے سید بن طاؤس کی کتاب "زوائد الفوائد" سے نقل کیا ہے . . . ہاں بحار الانوار میں ایک حدیث ایسی ضرور لکھی ہوئی ہے، مگر یہ حدیث چند وجوہات کی بناء پر قابل اعتبار و عمل نہیں ہے:

۱۔ اس حدیث میں لکھا ہے کہ ۹/ربیع الاول کو جو گناہ چاہیں کریں اس کو فرشتے نہیں لکھتے اور نہ ہی عذاب کیا جاتا ہے.

اور ہم قرآن مجید کے سورۂ زلزال کی آیت ۷ اور ۸ میں پڑھتے ہیں کہ "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ" "یعنی جس شخص نے ذرہ برابر نیکی کی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس شخص نے ذرہ برابر بدی کی ہے تو وہ اسے دیکھ لے گا"

اور ہمارے سامنے رسول خدا کی وہ حدیث بھی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: اگر کسی سے ایسی حدیث سنو جو ہم سے منسوب ہو اور قرآن سے ٹکرا رہی ہو تو اسے دیوار پر دے مارو یعنی اس پر عمل نہ کرو، مذکورہ روایت قرآن سے ٹکرا رہی ہے لہٰذا قابل عمل نہیں ہے.

۲۔ اس حدیث کے راوی غیر معتبر ہیں، چنانچہ جب میں نے قم میں آیت اللہ شاہرودی صاحب سے استفتاء کیا تو زبانی طور پر آپ نے فرمایا کہ: "اس روایت کو علامہ مجلسی نے کتاب اقبال سے نقل کیا ہے اور اس کے راوی غیر معتبر ہیں . . . ۹/ربیع الاول کا مرفوع قلم نہ ہونا اظہر من الشمس ہے" (لہٰذا مذکورہ روایت غیر معتبر ہے)

۳۔ اس روایت میں ایک جملہ اس طرح آیا ہے کہ:

"رسول اللہ . . . نے امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام -(جو کہ ۹/ربیع الاول کو آپ کے پاس بیٹھے تھے) سے فرمایا کہ اس روز کی برکت اور سعادت تمہارے لئے مبارک ہو کیوں کہ آج کے دن خداوند عالم تمہارے اور تمہارے جد کے دشمنوں کو ہلاک کرے گا"

رسول اسلام اگر مستقبل میں رونما ہونے والے کسی واقعہ یا حادثہ کی خبر دیں تو سو فی صد صحیح، سچ اور وقوع پذیر ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صادق الوعد ہیں.

لیکن معتبر تاریخ میں کسی بھی دشمن رسول و آل رسول کی ہلاکت ۹/ربیع الاول کے روز نہیں ملتی لہٰذا روایت قابل اعتبار نہیں ہے.

۴۔ اس روایت کے آخر میں امام علی علیہ السلام کے حوالے سے ۹/ربیع الاول کے ۵۷ نام ذکر کئے گئے ہیں جن میں یوم رفع القلم (گناہ نہ لکھے جانے کا دن) یوم سبیل اللہ تعالیٰ (اللہ کے راستے پر چلنے کا دن) یوم قتل المنافق (منافق کے قتل کا دن) یوم الزحد فی الکبائر (گناہان

---

[1] سوال و جواب، صفحہ ۱۰ و ۱۱، از آیت اللہ العظمی کاشف الغطاء، ترجمہ، مولانا (ڈاکٹر) سید حسن اختر صاحب نوگانوی، منجانب ادارۂ تبلیغ و اشاعت نوگانواں سادات

کبیرہ سے بچنے کا دن) یوم الموعظہ (وعظ و نصیحت کا دن) یوم العبادۃ (عبادت کا دن) بھی شامل ہیں جو آپس میں متصادم ہیں یعنی ۹/ ربیع الاول کو گناہ نہ لکھنے کا دن کہہ کے سب کچھ کر ڈالنے کی تشویق بھی ہے تو یوم نصیحت و عبادت و زہد کہہ کر گناہوں سے روکا بھی گیا ہے اور یہ تضاد کلام معصوم علیہ السلام سے بعید ہے اس کے علاوہ قتل منافق کا روز بھی کہا گیا ہے جس کی تردید آیت اللہ کاشف الغطاء اور آیت اللہ شاہرودی کے حوالے سے ہم کر ہی چکے ہیں، لہٰذا یہ روایت غیر معتبر ہے.

۵۔ اس روایت میں ایک جملہ یہ بھی آیا ہے کہ:

"اللہ نے وحی کے ذریعہ حضرت رسول سے کہلایا کہ: اے محمد! میں نے کرام کاتبین کو حکم دیا ہے کہ وہ ۹/ ربیع الاول کو آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے وصی کے احترام میں لوگوں کے گناہوں اور ان کی خطاؤں کو نہ لکھیں"

جب کہ دوسری طرف قرآن مجید میں خداوند عالم اس طرح ارشاد فرماتا ہے کہ: "هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ"[1] "یہ ہماری کتاب (نامۂ اعمال) ہے جو حق کے ساتھ بولتی ہے اور ہم اس میں تمہارے اعمال کو برابر لکھوا رہے تھے"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے اعمال ضرور لکھے جاتے ہیں، اور کسی بھی روز کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے.

"وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصٰهَا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِراً وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَداً"[2]

"اور جب نامۂ اعمال سامنے رکھا جائے گا تو دیکھو گے کہ مجرمین اس کے مندرجات کو دیکھ کر خوفزدہ ہوں گے اور کہیں گے ہائے افسوس! اس کتاب (نامۂ اعمال) نے تو چھوٹا بڑا کچھ نہیں چھوڑا ہے اور سب کو جمع کر لیا ہے اور سب اپنے اعمال کو بالکل حاضر پائیں گے اور تمہارا پروردگار کسی ایک پر بھی ظلم نہیں کرتا ہے"

اس آیت سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسانوں کے اعمال برابر لکھے جاتے ہیں اور کوئی بھی موقع اور دن اس سے مستثنیٰ نہیں ہے.

"يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتاً لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَّرَهٗ"

[3]"اس روز سارے انسان گروہ گروہ قبروں سے نکلیں گے تاکہ اپنے اعمال کو دیکھ سکیں پھر جس شخص نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اسے دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہے وہ اسے دیکھ لے گا"

اس روایت سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انسانوں کے چھوٹے بڑے ہر قسم کے اعمال ضرور لکھے جاتے ہیں.

یہ روایت آیات قرآنی سے ٹکرا رہی ہے لہٰذا غیر معتبر ہے.

---

[1] سورۂ جاثیہ، آیت ۲۹

[2] سورۂ کہف، آیت ۴۹

[3] سورۂ زلزلہ، آیت ۵-۱۸

ہو سکتا ہے بعض حضرات یہ اعتراض کریں کہ اتنی معتبر شخصیات جیسے علامہ ابن طاؤس، شیخ صدوق اور علامہ مجلسی وغیرہ نے کس طرح ضعیف روایتوں کو اپنی کتابوں میں جگہ دے دی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شیعہ علماء نے کبھی بھی اہل سنت کی طرح یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ ہماری کتابوں میں جو بھی لکھا ہے وہ سب صحیح ہے، بلکہ ہمیں ان کی چھان بین کی ضرورت رہتی ہے، کیوں کہ جس زمانہ میں یہ کتابیں مرتب کی گئیں وہ پُر آشوب دور تھا اور شیعوں کی جان ومال، عزت و آبرو کے ساتھ ساتھ ثقافت بھی غیر محفوظ تھی جس کی مثالوں سے تاریخ کا دامن بھرا پڑا ہے، مسلمان حکمراں شیعوں کے علمی سرمایہ کو نذرِ آتش کرنا ہرگز نہ بھولتے تھے، ایسے ماحول میں ہمارے علمائے کرام نے ہر اس روایت اور بات کو اپنی کتابوں میں جگہ دی جو شیعوں سے تعلق رکھتی تھی، جس میں بعض غیر معتبر روایات کا شامل ہو جانا باعث تعجب نہیں ہے، چونکہ اُس زمانہ میں چھان پھٹک کا موقع نہ تھا اس لئے یہ کام بعد کے علماء نے فرصت سے انجام دیا، جبھی تو آیت اللہ کاشف الغطاء اور آیت اللہ شاہرودی کے علاوہ دیگر مراجع کرام ۹/ربیع الاول والی اس روایت کو ضعیف مانتے ہیں.

ہمیں چاہئے کہ اِس روز بھی اسی طرح اپنے آپ کو گناہوں سے بچائیں جس طرح دوسرے ایام میں بچانا واجب ہے، ہمارے آئمہ علیہم السلام اور فقہائے عظام و مراجع کرام کا یہی حکم ہے، چنانچہ جب میں نے اِس بابت مراجع کرام آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای، آیت اللہ مکارم شیرازی، آیت اللہ فاضل لنکرانی، آیت اللہ اراکی اور آیت اللہ صافی گلپایگانی سے قم میں یہ استفتاء کیا کہ:

"بعض لوگ عالم و غیر عالم اس بات کے معتقد ہیں کہ ۹/ربیع الاول سے (جو کہ عید زہرا علیہا السلام سے منسوب ہے) ۱۱/ربیع الاول تک انسان جو چاہے انجام دے چاہے وہ کام شرعاً ناجائز ہو تب بھی گناہ شمار نہیں ہوگا اور فرشتے اسے نہیں لکھیں گے، برائے مہربانی اس بارے میں کیا حکم ہے بیان فرمائیے

آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای صاحب نے اس طرح جواب دیا کہ:

"شریعت کی حرام کی ہوئی وہ چیزیں جو جگہ اور وقت سے مخصوص نہیں ہیں کسی مخصوص دن کی مناسبت سے حلال نہیں ہوں گی، بلکہ ایسے محرمات ہر جگہ اور ہر وقت حرام ہیں اور جو لوگ بعض ایام میں ان کو حلال کی نسبت دیتے ہیں وہ کو راجھوٹ اور بہتان ہے اور ہر وہ کام جو بذات خود حرام ہو یا مسلمانوں کے درمیان تفرقے کا باعث ہو شرعاً گناہ اور عذاب کا باعث ہے"

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی صاحب کا جواب یہ تھا کہ:

"یہ بات (کہ ۹/ربیع الاول کو گناہ لکھے نہیں جاتے) صحیح نہیں ہے اور کسی بھی فقیہ نے ایسا فتویٰ نہیں دیا ہے، بلکہ ان ایام میں تزکیۂ نفس اور اہل بیت علیہ السلام کے اخلاق سے نزدیک ہونے اور فاسق و فاجروں کے طور طریقوں سے دور رہنے کی زیادہ کوشش کرنی چاہئے"

آیت اللہ فاضل لنکرانی صاحب نے یوں جواب دیا کہ:

"یہ اعتقاد (کہ ۹/ربیع الاول کو گناہ لکھے نہیں جاتے) غیر صحیح ہے ان ایام میں میں بھی گناہ جائز نہیں ہے، مذکورہ عید (عید زہرا علیہا السلام بغیر گناہ کے منائی جاسکتی ہے"

آیت اللہ اراکی صاحب نے تحریر فرمایا کہ:

"وہ کام جن کو شریعت اسلام نے منع کیا ہے اور مراجع کرام نے اپنی توضیح المسائل میں ذکر کیا ہے کسی بھی وقت جائز نہیں ہیں، اور یہ باتیں کہ (۹/ربیع الاول کو گناہ لکھے نہیں جاتے) معتبر نہیں ہیں"

آیت اللہ صافی گلپایگانی صاحب کا جواب تھا کہ:

"یہ بات کہ (۹/ربیع الاول کو گناہ لکھے نہیں جاتے) ادلۂ احکام کے عمومات و اطلاقات کے منافی ہے اور ایسی معتبر روایت کہ جو ان عمومی و مطلق دلیلوں کو مخصوص یا مقید کر دے ثابت نہیں ہے بالفرض اگر ایسی کوئی روایت ہوتی بھی تو یہ بات عقل و شریعت کے منافی ہے اور ایسی مقید و مخصص دلیلیں منصرف ہیں..."

یہ بات واضح ہو جانے کے بعد اب ایک سوال اور باقی رہ جاتا ہے، وہ یہ کہ اس خوشی کو کس طرح منائیں...؟ اسی طرح جیسے اکثر بستیوں میں منائی جاتی ہے؟ یا پھر اس میں تبدیلی ہونی چاہئے؟

جن ہستیوں سے یہ خوشی منسوب ہے اُن کے کردار کی جھلک بھی اس خوشی اور عید میں نظر آنی چاہئے یا نہیں؟

یہ خوشی امام زمانہ علیہ السلام اور حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام سے منسوب ہے تو کیا ہمیں ان معصومین علیہم السلام کے شایان شان اس خوشی کو نہیں منانا چاہئے؟... ہمیں کیا ہو گیا ہے! اپنے زندہ امام کی خوشی کو اس انداز سے مناتے ہیں؟ دنیا کی جاہل ترین قومیں بھی اپنے رہبر کی خوشی اس طرح نہ مناتی ہوں گی...

افسوس صد ہزار افسوس! آج کل اگر کسی سیاسی و سماجی شخصیت کے اعزاز میں جلسے جلوس منعقد کئے جاتے ہیں تو ان کو اُسی کے شایان شان طریقے سے اختتام تک پہنچانے کی کوشش بھی کی جاتی ہے.

لیکن عید زہرا! علیہا السلام جو خاتونِ جنت، جگر گوشۂ رسول زوجۂ علی مرتضیٰ علیہ السلام اُم الائمہ زہرا بتول علیہا السلام کے نام سے منسوب ہے وہ اس طرح منائی جاتی ہے کہ اس میں شریف انسان شریک ہونے کی جرأت بھی نہ کر سکے؟!

اس کے علاوہ عالم اسلام پر جس طرح خطرات کے بادل چھائے ہوئے ہیں وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے، کتنا اچھا ہو، اگر عید زہرا علیہا السلام اپنے حقیقی معنوں میں اس طرح منائی جائے جس میں تمام مسلمین شریک ہو سکیں.

تبرا فروع دین سے تعلق رکھتا ہے اور فروع دین کا دارومدار عمل سے ہے... اگر کوئی مسلمان صرف زبان سے کہے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس وغیرہ واجب ہیں تو یہ تمام واجبات جب تک عملی صورت میں ادا نہ ہو جائیں گردن پر قضا ہی رہیں گے... فروع دین کے واجبات وقت اور زمانے سے مخصوص ہیں، جس طرح نماز کے اوقات بتائے گئے ہیں اسی طرح روزہ، زکوٰۃ، حج اور خمس وغیرہ کا زمانہ بھی معین ہے، لیکن امر بالمعروف، نہی عن المنکر، تولا اور تبرا یہ دین کے ایسے فروع ہیں جن کے لئے کوئی وقت اور زمانہ معین نہیں ہے، بالخصوص تولا اور تبرا سے تو ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں رہ سکتے، یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایک منٹ کے لئے محبت اہل بیت علیہم السلام کو دل

سے نکال دیا گیا ہے یا ایک لمحہ کے لئے دشمنان اہل بیت علیہم السلام کے کردار کو اپنالیا گیا ہے، جب ایسا ہے... تو پھر تبرا ۹/ربیع الاول سے کیوں مخصوص کر دیا گیا؟ اِسی روز اس کی کیوں تاکید ہوتی ہے؟ باقی دنوں میں اس طرح کیوں یاد نہیں آتا؟ وہ بھی صرف زبانی!...

زبان سے تبرا کافی نہیں ہے بلکہ عملی میدان میں آکر تبرا کریں یعنی اہل بیت علیہم السلام کے دشمنوں کی اطاعت و حکمرانی دل سے قبول نہ کریں اور ان کے پست کردار کو نہ اپنائیں.

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شیعہ جو خمس نہ نکالتا ہو اور بیٹیوں کو میراث سے محروم رکھتا ہو وہ غاصبین پر لعنت کرے اور اس لعنت میں خود بھی شامل نہ ہو جائے.

وہ شیعہ جو اپنے عملِ بد سے اہل بیت علیہ السلام کو ناراض کرتا ہو اور وہ اہل بیت علیہم السلام کو ستانے والوں پر لعنت کرے اور اس لعنت کے دائرے میں خود بھی نہ آجائے.

یاد رکھئے! لعنت نام پر نہیں، کردار پر ہوتی ہے اسی لئے اس کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے

اخباری ترشے

خداوند کریم کے لطف و کرم اور حضرت بقیۃ اللہ الاعظم عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف کی خاص توجہات کے طفیل معاونت آموزش نمایندگی جامعۃ المصطفیٰ ہندوستان کی جانب سے پانچواں "کل ہند علمی مسابقہ" بتاریخ ۲۳/ذی الحجہ ۱۴۴۴ مطابق ۱۲/جولائی ۲۰۲۳ بروز بدھ ہندوستان کے ۷۳ دینی مدارس میں برگزار ہوا۔

جس میں ۳ مدرسہ بعنوان "مدارس ممتاز" منتخب ہوئے:

۱۔ حوزہ علمیہ امام حسن عسکری کانودر الحمد للہ اس مدرسہ نے مسلسل پانچ آزمون علمی میں پہلا رتبہ حاصل کیا۔

۲۔ جامعہ الفاطمہ دہلی بخش خواہران میں پہلا رتبہ حاصل کیا۔

۳۔ جامعہ باب العلم بدگام بخش برادران میں دوسرا رتبہ حاصل کیا۔

اس آزمون علمی میں مندرجہ ذیل مدارس کے تمام طلاب کامیاب ہوئے

۱۔ جامعہ امام خمینی احمد آباد ۲ جامعہ امام موسی کاظم ناگپور، ۳ جامعہ حضرت زینب جوگیپورہ،

۴ جامعہ امام رضا سرینگر، ۵ مدرسہ قرآن آیت اللہ یوسف بدگام ۶۔ مدرسہ حسینیہ گھوسی برادران۔

اس آزمون میں جن مدارس کے طلاب کی تعداد زیادہ تھی اوران کے زیادہ تر طلاب نے کامیابی حاصل کی وہ جامعہ امامیہ تنظیم المکاتب لکھنو، و جامعہ الزہرا تنظیم المکاتب لکھنو ہیں۔

توجہ:

۱۴۷، طالب علم ۸۵ سے زیادہ نمبروں سے پاس ہوئے ہر سطح میں ان کے درمیان قرعہ اندازی کے ذریعہ تین طلاب کو انعامات سے نوازا جائے گا۔

معاونت امور اہل سنت

اطراف دہلی کے بعض عصری اور حوزوی مدارس کی بازدید عمل میں آئی جس میں زبان فارسی اور شعبہ گرگان میں حصول علم پر توجہ دلائی تاکہ دوریاں ختم ہوں اور ملل اسلامی دوسری ملتوں اور اقوام کے ساتھ امن و امان سے زندگی بسر کریں۔

شعبہ قرآنی:

ہر ہفتہ قرآن کا صفحہ اور ساتھ ہی آڈیو کلیپ تمام مدارس میں بھیجی جاتی ہے۔

تمام مدارس کے طلاب کو "تجوید الصلاۃ" کے عنوان کے تحت نماز میں سوروں اور اذکار کا صحیح تلفظ بتانے کی کوشش کی جارہی ہے نیز علم تجوید کی اہمیت و ضرورت سے بھی آگاہ کیا جارہا ہے۔